جلد ۹۵ جولائی ۱۹۸۱ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اعلان

ادارہ ترجمان القرآن نے رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں مندرجہ ذیل کتابوں پر خصوصی رعایت دینے کا فیصلہ کیا ہے

پارہ اوّل تفہیم القرآن	———	۶/۵۰	روپے
سورۃ الفاتحہ	———	۹/-	"
سورۃ النساء	———	۶/۲۵	"
سورۃ الفرقان	———	۳/-	"
سورۃ العنکبوت	———	۳/۵۰	"
سورۃ الاحزاب	———	۶/۵۰	"
سورۃ یٰسٓ	———	۳/-	"
سورۃ الفتح	———	۳/-	"
سورۃ الحجرات	———	۳/-	"
سورۃ الرحمٰن	———	۳/-	"
سورۃ لقمان	———	۳/-	"
تیسواں پارہ	———	۲۰/-	"
میزان		۶۹/۷۵	روپے
رعایتی قیمت		۴۵/-	روپے

بنیادی حقوق	DELUX	قیمت	۲۷/- روپے	رعایتی قیمت	۱۶/- روپے
بنیادی حقوق	P.B	"	۲۰/-	"	۱۲/- "

ادارہ ترجمان القرآن — ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ-لاہور

جلد ۹۵ — جولائی ۱۹۸۱ء — عدد ۵
ترجمان القرآن لاہور

جولائی ۱۹۸۱ء — رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۸

فہرست مضامین

جلد ۹۵ | جولائی ۱۹۸۱ء مطابق رمضان المبارک ۱۴۰۱ھ | عدد ۵

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

زرسالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ایک سرتوڑ مہم اور ایک جان کاہ تگ و تاز کا نام اسلام ہے۔

خدا تعالیٰ کی پکار اور اس کے پیغمبروں کی دعوت پر جن لوگوں کی فطرتِ سلیم جاگ اٹھتی ہے، اُن کے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ پکارتے ہی طاغوتی قوتوں کی طرف سے اُن کے خلاف ایک لامتناہی جنگ و تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ پس آنے والوں سے پہلے قدم پر ہی کہا جاتا ہے کہ آؤ تو سوچ سمجھ کر آؤ، خدا کا ساتھ دینا ہے تو خدا کے باغیوں اور طاغوتوں کو مسترد کر کے آؤ۔ اسلام کے کیمپ میں داخل ہوتے ہوئے خدا سے جانوں اور مالوں، اولادوں اور جائیدادوں، کھیتیوں اور تجارتوں، آسائشوں اور افزائشوں کا ایک ہی بار سودا کر کے آؤ۔

ایمانی عشق کی راہ جو رضائے الٰہی کی جنتوں تک جاتی ہے، سہل نہیں ہے۔ اس کے سالکوں کو بھکاریوں کی طرح دربدر پھرنا پڑتا ہے۔ وہ اگرچہ فرد فرد تک ہدایتِ ربانی کا نور پہنچانے جاتے ہیں تو درحقیقت دوسروں پر بڑا احسان کرتے ہیں، مگر انداز اُن کا ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی سائل کسی کے کوچۂ ناز سے اس طرح گزرے کہ اس خس دنماشاک کی بھی نازبرداریاں کرے۔ پھر جواب میں کبھی گالیاں، کبھی پتھر! کبھی اپنے بگڑ جاتے ہیں، کبھی مال و متاع چھن جاتے ہیں، کبھی گھر اُجڑ جاتے ہیں، کبھی وطن کو الوداع کہہ کر ہجرت کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے، اور ایسے وقت بھی آتے ہیں جب تلواریں تلواروں سے ٹکرا جاتی ہیں۔ یہ سارا کٹھن راستہ جہاد کا راستہ ہے۔ اس جہاد سے بھی سخت جہاد وہ ہوتا ہے جب اقتدار ہاتھ میں ہوتا ہے اور آدمی ناجائز طور پر کسی کو اُف نہیں کہہ سکتا۔ دولت کے انبار ہوتے ہیں لیکن اُن کے سب سے بڑے امانت داروں کو فاقہ مستی میں رہنا پڑتا ہے۔ عدل و قانون کا سارا زور جمع

ہوکر ہاتھ آتا ہے مگر ایک ادنیٰ شہری کے کسی حق کو اس سے چھینا نہیں جاسکتا - اور ایک معزز ترین اور انتہائی اقرب کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا جاسکتا - تب وہ انصاف قائم ہوتا ہے جس پر زمین و آسمان قائم ہیں۔

کتنی عظیم مہم ہے! اس میں عمریں کھپ سکتی ہیں، نسلوں کی محنتیں صرف ہوسکتی ہیں - دسیوں بار ناکامیوں اور شکستوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے، طرح طرح کی مخالفانہ سازشوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے، گرفتاریاں اور قیدیں پیش آسکتی ہیں - قرقیاں اور ضبطیاں ہوسکتی ہیں - صلیب و دار کے مراحل پیش آسکتے ہیں - ایسی عظیم اور مقدس مہم کے لیے بھرتی ہونے والے افراد کو یونہی نہیں چھوڑ دیا جاتا کہ جاؤ جیسے تمہارا جی چاہے، مزے اڑاؤ، بس اب تمہارا نام درج رجسٹر ہوگیا -

---

اسلام تو غلط ساخت پر بنی ہوئی دنیا کو توڑ کر نئی دنیا از سرِ نو تعمیر کرنے کا پروگرام ہے - یہ تو جاہلی یا مشرکانہ یا منکرِ خدا تہذیب کا تسلط ختم کرکے نئی خدا پرستانہ تہذیب کا دور شروع کرنے کی جدوجہد سے عبارت ہے - سیاسی ہیئتوں سے لڑائی ہے، رسم و رواج سے لڑائی ہے، اپنی اور اپنوں کی خواہشوں سے لڑائی ہے، لوگوں کی خود ایجاد کردہ شریعتوں سے لڑائی ہے - مذہبی دکانداریوں سے لڑائی ہے - ایسی بھاری لڑائی لڑنے کے لیے آدمی بس یونہی بغیر کسی تیاری کے نکل کھڑا ہو، یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں - اسلام فلاحِ انسانیت کی جس عظیم انقلابی مہم پر مشتمل ہے اس کے لیے لبیک کہنے والے ہر سپاہی کو عمر بھر کے لیے ایک ایسے تربیتی کورس کا پابند کیا جاتا ہے جو فکر و عقیدہ کو بھی مسلسل استحکام دیتا ہے، اخلاق و کردار کو بھی اور اجتماعیت کو بھی -

یہ مہم ایسے لوگوں کے ذریعے سے نہیں چل سکتی جو زبانی دعوے تو شاندار کریں اور عملاً برعکس زندگی گزاریں - اپنے آپ کو مسلمان کہیں، مگر نہ مسلمانوں کے سے فرائض ادا کریں اور نہ پابندیاں قبول کریں - اپنی ذاتی خواہشوں کی غلامی کرنے والے لوگ، دن رات دولت اور اسبابِ دنیا جمع کرنے کے خواب دیکھنے والے لوگ، اسراف و تبذیر میں مبتلا لوگ، رشوتیں کھانے والے اور خیانتیں کرنے والے لوگ، سودکالین دین اور کاروبار میں ہیر پھیر کرنے والے لوگ، قوت و اقتدار پاکر کمزوروں کو ستانے والے لوگ، اس مہم کے لیے عملاً مفید نہیں ہوسکتے، بلکہ الٹا مضر اور مزاحم ہوتے ہیں -

---

اس جان جوکھوں کی مہم کی تیاری کے لیے اسلام نے انسان کو خدا پرستانہ بنیادوں پر خود تسخیری کا جو پروگرام بنا کے دیا ہے، اُس میں روزے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

روزے کا ایک مقصد آبیاری ایمان اور خود احتسابی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت بخاری ہے کہ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ۔ ترجمہ: جس نے رمضان کے روزے بحالتِ ایمان و احتساب رکھے، اس کے تمام وہ گناہ معاف کر دیے گئے جو وہ پہلے کر چکا۔ حضرت ابوہریرہؓ ہی کی دوسری روایت میں مَنْ صَامَ کی جگہ مَنْ قَامَ کے الفاظ ہیں۔ یعنی جس نے بحالتِ ایمان و احتساب رمضان میں شبانہ عبادت کی اُس کے تمام سابق گناہ معاف ہوئے۔

یعنی تمام عبادات اور عملِ صالحہ کی طرح روزہ بھی وہی مطلوب ہے جسے آدمی محض خدا اور اس کے دین پر ایمان رکھنے اور اُس کو حق سمجھنے کی وجہ سے رکھے۔ اور اس سے اس کا مقصود بھی خدا تعالیٰ ہی کی خوشنودی ہو، بغیر کسی شعور اور جذبے کے، محض رسم داری کے طور روزہ رکھنا عبادت کی صحیح تعریف میں نہیں آتا۔ اسی طرح اگر نیت صحت کے لیے فاقہ کشی کی ہو یا لوگوں میں تقدس و تقشف کی شہرت مطلوب ہو، تو روزہ سے اصل مقاصد حاصل نہ ہوں گے۔

احتسابًا کی شرط یہ معنی رکھتی ہے کہ آدمی اپنے نفس کی کیفیات پر نگاہ رکھے۔ اور خواہشات قلب پر جو دباؤ ڈالیں اُن کے بارے میں چوکنا رہے۔ اپنے خیالات کی رو اور، جذبات کے تموّج، زبان کے تکلم اور لین دین اور زندگی کے تمام دوسرے معاملات میں سخت محتاط رہے کہ کوئی بات خدا کی مرضی اور شریعت کے احکام اور روزے کے تقاضوں سے انحراف کی باعث نہ بنے۔ اپنی ذات کی یہ پاسبانی و نگہداری ایک ایسی مطلوب صفت ہے جس کی پرورش روزوں کے دوران میں خاص طور پر زیادہ اچھی طرح ہوتی ہے ___ مومن کی ساری زندگی دراصل ایمان و احتساب کی زندگی ہوتی ہے اور وہ ہمہ وقت خود احتسابی کی کمین گاہ میں بیٹھ کر اپنا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ دین کی پیروی اور شریعت کی پابندی اور اقامتِ دین کی جدوجہد، ایمان و احتساب کے برسرِ عمل ہوئے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ جس طرح روزے میں آدمی کو ہر آن یہ احساس رہتا ہے کہ کہیں میرا روزہ ٹوٹ نہ جائے۔ اسی طرح پوری زندگی بسر کرتے ہوئے اس پر فکر طاری رہتی ہے کہ کہیں کسی غلط کاری کی

وجہ سے میری زندگی رائیگاں نہ چلی جائے۔

قرآن میں ماہ صیام کے روزوں کو فرض کرتے ہوئے مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ" یعنی اللہ تعالیٰ ہماری روزہ داری کا یہ اثر دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں تقویٰ پیدا ہو جائے۔ تقویٰ بھی ایک مہینے کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ ساری زندگی کے لیے مطلوب ہے۔ البتہ رمضان کا مہینہ بطورِ خاص تقویٰ کی رُوح کو مضبوط کرنے کا وسیلہ ہے۔ وہی بات جو اُوپر "ایمان و احتساب" کے سلسلے میں بیان ہو چکی ہے، تقویٰ بھی اسی کا نام ہے، یعنی خدا کے ہونے پر یقین رکھتے ہوئے، روزے کو اس کے حکم کے طور پر اختیار کرنا۔ اور پھر اُس کے دوران میں سحری سے لے کر افطاری تک اور تراویح سے لے کر گھر اور معاش کے تمام معاملات میں خدا کے پسندیدہ اور ناپسندیدہ طریقوں کا لحاظ کرنا اور ہر قدم پر اُس کی رضا پر نگاہیں جمائے رکھنا۔ یہی مسلکِ تقویٰ ہے۔ وہ صاحبِ ایمان جو خدا کی رضا کے لیے بدن کی جائز اور حقیقی خواہشات و ضروریات پر اپنے آزاد رضاکارانہ جذبے سے پابندیاں عاید کرتا ہے۔ اور پھر خود ہی اُن کی پاسداری کرتا ہے، اُس سے بڑھ کر کون مسلکِ تقویٰ کا سالک ہو سکتا ہے۔

سچی دینداری، بلکہ تمام تر تہذیب اسی کا نام ہے کہ آدمی خدا کی مرضیات کے تحت اپنے اُوپر خود پابندیاں عاید کرے اور پھر اپنی نگرانی آپ کرے۔

کوئی بہترین مرغن کھانے کھانے والا اور بہترین مشروبات پینے والا وہ لطف حاصل نہیں کر سکتا، جو ایک روزہ دار اپنے اُوپر خدا کے حکم کے تحت دن بھر کے مکمل فاقے کی پابندیاں عاید کر کے حاصل کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تمام کھانے والے بھوکے اور تمام پینے والے پیاسے رہتے ہیں۔ رُوح کی بھوک اور رُوح کی پیاس کا اُن کے پاس کوئی علاج نہیں۔ اسی طرح کوئی آرام و آسائش میں پڑا ہوا شخص ایسا نہیں جو اپنی نیند کو خراب کر کے تراویح میں کھڑے ہوتے اور سحری کو بیدار ہونے والے مومن کے برابر قوت حاصل کر سکے۔ خدا کی خوشنودی کے لیے بھوک پیاس اور بے آرامی برداشت کرنے والے کو قلب و رُوح اور ضمیر و اخلاق کی وہ قوت حاصل ہوتی ہے۔ جس کے بل پر وہ مزاحم ہونے والی سیاسی تمدنی چٹانوں سے اپنے ایک " ذرۂ دردِ دل" کو ٹکرا دیتا ہے۔

عام طور پر روزے کا مشہور تصور یہی ہے کہ آدمی مقررہ وقت کے لیے کھانے پینے اور ازدواجی رابطے سے بے تعلق رہے۔ لیکن شارع نے روزے کا یہ تصوّر نہیں دیا ہے۔ وہ روزے کے ظاہری محدود ڈھانچے کے اندر پورے دین کے تقاضوں کی تکمیل چاہتا ہے۔ حضورؐ کے ایک ارشاد کی روایت حضرت ابوہریرہؓ نے یوں کی ہے۔

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ زُوْرٍ
وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ
فِيْ اَنْ يَّدَعَ طَعَامَهٗ وَشَرَابَهٗ
(بخاری)

جو شخص (روزہ رکھ کر) جھوٹ بولنا
اور جھوٹ پر عمل کرنا (یعنی خلافِ شریعت امور)
نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی کوئی حاجت
نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دے۔

واضح ہوا کہ روزے کی اصل روح اور اس کا اصل مطلوب ترکِ زور یا ترکِ گناہ ہے۔ بات پھر کر وہیں تقویٰ پر آگئی۔ یعنی روزہ اِس بات کی اپنے آپ کو تربیت دینا ہے کہ آدمی جو کام کرے، خدا کی اجازت سے کرے اور جس چیز کو ممنوع ٹھہرایا گیا ہو، اُس سے باز رہے۔ حتیٰ کہ حضرت ابوہریرہؓ ہی کی ایک دوسری روایت کے مطابق روزہ دار یہاں تک احتیاط کرے کہ اگر کوئی شخص اس سے جھگڑا کرے یا گالی دے تو جواب میں وہ نہ جھگڑے اور نہ گالی دے، بلکہ صبر کرے۔ ضرورت ہو تو زیادہ سے زیادہ اُس سے معذرت کر سکتا ہے کہ بھائی مجھے معاف کر دینا، میں روزے سے ہوں اور دنگے فساد یا گالم گلوچ میں حصّہ نہیں لے سکتا۔

کجا یہ کہ روزہ رکھ کر (وہ بھی جسے توفیق ہو) بے شمار مسلمان بے محابا جھوٹ بولتے ہیں، غیبت کرتے ہیں، جھوٹی گواہی دیتے ہیں، گالی بکتے ہیں، رشوت لیتے دیتے ہیں، سود اور قمار سے آلودہ ہوتے ہیں۔ گندے گانے سنتے ہیں، نگاہوں کو فسق آلود کرتے ہیں، لین دین میں ہیر پھیر کرتے ہیں، گھٹیا فلموں سے دل بہلاتے ہیں ـــــ اور اُن میں سے کسی کو خیال نہیں آتا کہ روٹی کا لقمہ کھانے یا پانی کا گھونٹ پینے سے تو اُن کے روزے کے صرف ظاہری ڈھانچے میں دراڑ پڑتی ہے، مگر ان کے اخلاق و معاملات کی خرابی سے تو روزے کی رُوح ہی ہلاک ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اُدھر سے کہا جاتا ہے کہ میاں تمہارے اس کھوکھلے فاقے کی ہمارے ہاں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، لے جاؤ اسے اپنے پاس سینت کے رکھو۔

یہ ہے روزے کی اصل حقیقت جسے سامنے رکھیں تو یہ راز سمجھ میں آسکتا ہے کہ حق کے سپاہیوں کو اس کی کتنی اشد ضرورت ہے۔ ہر سال ماہ رمضان کے تربیتی کورس سے گزر کر وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو اسلامی انقلاب کی دعوت کی علمبرداری کے لیے ضروری ہے۔

علاوہ ازیں اس وقت ہمارا معاشرہ دولت پرستی اور لذّت مستی کی جن خرابیوں کا شکار ہو رہا ہے۔ اور اس پر طرح طرح کے جو نظریاتی حملہ آور ہیں، نیز جو سامراجی اور سازشی قوتیں مختلف اطراف سے منڈلا رہی ہیں، اُن کی وجہ سے ہر صاحبِ ایمان و شعور کو تشویش ہے کہ ہم نہ جانے کدھر لیے جا رہے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمارے مترفین اور مسرفین اور پھر اُن کی نقالی میں ہم خود سب کے سب مبتلا ہو کر کسی خوفناک نتیجے کی طرف چلے جا رہے ہوں؟

حالات کا یہ جو کچھ بھی بگاڑ ہمارے سامنے ہے اور جس کے اثر سے ہم خود بھی پوری طرح نجات یافتہ نہیں ہیں، اس کے خلاف معرکہ آرائی کے لیے رمضان کا محاذ نہایت ہی مضبوط محاذ ہے۔ روزہ لادینیت اور مادہ پرستی اور بندگیٔ ہوس کی قوتوں کے خلاف ایک مؤثر جہاد ہے۔ جہاں روزہ ہوگا جہاں سحری و افطاری ہوگی، جہاں تراویح اور تلاوتِ قرآن کا سلسلہ ہوگا، وہاں الحاد اور فحاشی اور جنسیت اور ہوسناک ثقافت کے چلتر نہیں چل سکتے۔

لوگوں کو چاہیے کہ وہ خود ہی روزہ رکھنے پر اکتفا نہ کریں۔ بلکہ عزیزوں، دوستوں، کاروباری اور دفتری ساتھیوں، شہروں اور دیہات کے لوگوں تک پہنچیں اور روزہ نہ رکھنے والوں کو ترغیب دلائیں کہ وہ روزہ رکھیں۔ رمضان دعوت الی اللہ اور دعوتِ اقامتِ دین کا بہترین ذریعہ ہے۔ افراد نکلیں اور وفود نکلیں اور گروہ نکلیں، لوگوں کو پیار سے سمجھائیں، رمضان کی برکات سے آگاہ کریں، خدا اور رسولؐ کی محبت کی لَو اُن کے اندر تیز کریں، ضعیف اور معذور اور مریض مسلمانوں نیز غیر مسلموں کو بھی دوسری تلقین یہ کریں کہ وہ کم سے کم رمضان کا احترام سختی سے ملحوظ رکھیں۔ خصوصاً لاابالی نوجوانوں کو پیار سے یہ سمجھایا جائے کہ وہ برسرِعام سگریٹ نوشی نہ کریں۔ اس سلسلے میں ہوٹل والوں اور سامانِ خورد و نوش بیچنے والے دکانداروں سے بھی دردمندانہ اپیل کی جائے کہ وہ چند پیسوں کے لیے رمضان کی بے حرمتی نہ کریں۔

الحاد و کفر اور مادہ پرستی کی حملہ آور تحریکوں کے اس دور میں وہ دینداری کافی نہیں کہ آدمی اپنی جگہ اللہ اللہ کرے اور نماز روزہ میں مصروف رہے۔ اس طرح کی دینداری دُنیا کے کئی حصوں میں بُری طرح کچل دی گئی ہے۔ اب تو اگر کسی کو مسلمان رہنا ہو اور اپنے اہل و عیال اور آئندہ نسلوں کو اسلام سے وابستہ رکھنا ہو تو یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ وہ ذاتی دینداری پہ اکتفا نہ کرے، بلکہ اجتماعی اصلاح کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی دعوت دے۔ حق تو یہ ہے کہ دور کوئی بھی ہو، یہ دعوت دین کا ایک نہایت اہم تقاضا رہی ہے کہ بغیر اس کے ذاتی دینداری کا حق بھی ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس عظیم کارِ دعوت کے لیے جو لوگ اٹھیں، اُن کا ایک منظم قوت ہونا ضروری ہے۔

پس صائمین و صائمات اٹھ کھڑے ہوں۔ رمضان کے بابرکت ماحول میں خدا کے دین کا پیغام پھیلانے کے لیے پروگرام سوچیں۔ مگر اس پر اکتفا نہ کریں کہ کہیں کہیں درسِ قرآن و حدیث کا انتظام ہو جائے یا مجالسِ افطار میں دین کا پیغام دینے کے انتظامات ہو جائیں بلکہ اوّلین اہمیت انفرادی ملاقاتوں اور انفرادی توجہ کو حاصل ہے۔

اگر روزہ دار طبقے کسل مندی کا شکار ہو کر دعوتِ دین اور دعوتِ اقامتِ دین کا کام ہر ماحول میں اور ہر ذریعے سے نہیں کریں گے تو نتائج کی تلخی کا اندازہ رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی اُس حدیث سے کیجیے جسے حضرت حذیفہؓ نے روایت کیا اور ترمذی نے بطور حدیث حسن اپنی کتاب میں شامل کیا۔ (ترجمہ):-

> "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تمہیں لازماً معروف کی تلقین کرنی ہوگی اور تمہیں لازماً منکر سے روکنا ہوگا۔ یا پھر اس بات کا اندیشہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی طرف سے کسی ایسے خمیازے سے دوچار کر دے کہ اس کے بعد تم اُس کے حضور میں دُعائیں کرو، مگر تمہاری کوئی شنوائی نہ ہو" (او کما قال)

خداوند کریم رحم فرمائے اور ہم کو ایسی پست حالت میں مبتلا نہ کرے کہ ہم پر اس کی طرف سے ایسی گرفت ہو کہ ہماری دُعاؤں کے لیے اس کے دروازے بند ہو جائیں۔

بنی نوعِ انسان پر اسلام کے احسانات

پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

خلیفۃ اللہ اسلام وہ دین ہے جس نے نوعِ بشر کو شرفِ انسانیت سے ہم کنار کیا۔ ساری مذہبی کتابوں میں قرآن مجید ہی وہ کتاب ہے جس نے انسان کے "خلیفۃ اللہ" ہونے کا اعلان کیا ہے۔ خلیفہ ہونے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ زمین پر انسان خود مختار ہے اور آزاد ہے۔ ساری کائنات جاندار، غیر ذی رُوح اور غیر ذی عقل مخلوقات سے بھری پڑی ہے۔ فرشتے بھی حکم کے پابند ہیں اور غلام ہیں۔ کائنات میں صرف انسان ہی وہ واحد ہستی ہے جو آزاد ہے اور خود مختار ہے۔

انسان کے خلیفہ ہونے کا اعلان سن کر اول میں فرشتوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ یہ خود مختار ہستی ضرور دُنیا میں فتنہ و فساد پھیلائے گی۔ ضرور خون خرابہ کرے گی۔ اس اعتراض کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم اور عقل کی نعمت سے نوازا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (سورہ بقرہ - ۳۱) "اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام نام سکھا دیئے"۔

اسماء سے مراد تصورات (CONCEPTS) ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرتِ آدم میں تصور سازی ——— یعنی انتزاعِ خصائص محسوسات ——— کی صفت ودیعت کر دی ہے۔ تخیل، تفکر، تدبر اور تعقل سب درحقیقت تصور سازی کے مراتب عالیہ ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و فہم کی دولت سے مالا مال کر دیا۔ اعتراض کے جواب میں عقل کی بخشش کا مطلب یہ ہوا کہ اعتراض کا دفعیہ عقل کے ذریعے ہو جائے گا۔

عقل انسان کی بہترین رفیق ہے۔ مادی اشیاء کو سمجھنے میں اور پھر ان کو استعمال کرنے میں عقل نے

انسان کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ دنیا میں انسان کے گرد سب سے بڑا دائرہ مادی اشیاء کا پھیلا ہوا ہے۔ یہ طبیعیات کی دنیا ہے۔ مادی دنیا کو سمجھنے کے لیے عقل بالکل کافی ہے۔ عقلِ انفرادی سے اگر کبھی غلطی سرزد ہو جاتی ہے تو عقلِ اجتماعی اس غلطی کی اصلاح کر دیتی ہے۔ مادہ کو تحلیل کرنے، اس کے خواص معلوم کرتے، اس کو پرکھنے جانچنے اور استعمال کرنے میں عقلِ انسانی کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ صدیوں سے عقل کی کدوکاوش جاری ہے۔ اس کے نتیجے میں مادی دنیا سے متعلق جمع کردہ ایک عظیم الشان ذخیرہ آج انسانوں کے پاس جمع ہو گیا ہے۔ اس ذخیرہ کو استعمال کرنے سے انسان نے حیران کن ایجادات اور اختراعات کر ڈالی ہیں۔ اس کی وجہ سے آج انسان ہوا میں اُڑ رہا ہے، پانی میں تیر رہا ہے اور پہاڑوں کا جگر چیر رہا ہے۔

دنیا میں انسانوں کے گرد دوسرا بڑا دائرہ خود انسانوں کا ہے۔ یہ دنیائے انسانیت ہے۔ انسان غیر ذی روح اور غیر ذی عقل مادہ نہیں ہے۔ انسان عقل، شعور اور ارادہ کی دولت سے مالا مال ہے اس لیے انسانوں کا تجزیہ کرنا اور تحلیل کرنا عقل کے لیے انتہائی دشوار کام ہے۔ پھر ذی شعور اور بااختیار ہونے کے سبب کوئی بھی دو انسان اس طرح یکساں نہیں ہیں جس طرح دو پتھر یکساں ہوتے ہیں۔ اس لیے عالمِ انسانیت میں عمرانی، تمدنی، اخلاقی اور مذہبی پہلوؤں میں عقل کی کارگزاری کی تحسین کرتے ہوئے بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ عالمِ انسانیت میں عقل کی کدوکاوش کے نتائج اتنے صحیح اور یقینی نہیں ہوتے جتنے کہ مادی دنیا سے متعلق یقینی ہوتے ہیں۔ یہاں عقل کی تنقیص مقصود نہیں ہے، بلکہ اس کی محدودیت اور نارسائی کا تذکرہ کرنا مقصود ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

انسانوں کے گرد تیسرا دائرہ مادی دنیا سے ماورا اور عالمِ انسانیت سے ماورا ——— حقیقتِ کبریٰ کا ہے۔ حقیقتِ کبریٰ کے علم کے بغیر نہ عالمِ طبیعیات کی حقیقت کھلتی ہے اور نہ عالمِ انسانیت کی حقیقت واضح ہوتی ہے۔ مگر حقیقتِ کبریٰ کا دائرہ عقلِ انسانی کے لیے غیب ہی غیب ہے۔ فطرتِ انسانی کو غیب جاننے کا بے حد اشتیاق ہے۔ مگر یہاں پرواز کرنے سے عقلِ انسانی کے پر جلتے ہیں۔ اس مختصر جائزہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بلاشبہ عقل رہنمائی کے فرائض انجام دیتی ہے، مگر بعض دائروں میں اس کی رہنمائی ناکافی ہے۔ اس لیے فرشتوں کے اعتراض کا یہ شافی اور وافی جواب نہیں ہوا۔ اس موقع پر عقل کی نارسائی اور محدودیت کا نقص دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک دوسرے انعام سے نوازا۔ فرمایا: قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (البقرہ ۔ ۳۸) "ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری ہدایت کی پیروی کریں گے اُن کے لیے خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔" پھر اس کے بعد فرمایا "اور جو اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ تو آگ میں جلنے والے ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ عقل کا نقص میں ہدایت الٰہی سے دُور کر دوں گا۔ یہ ہدایت میں اپنے رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ دُنیا میں انسانوں کو بھیجتا رہوں گا۔ اب جو لوگ اس ہدایت کی پیروی میں زندگی بسر کریں گے، وہ امن و چین کی زندگی گذاریں گے۔ اور وہ خلافت کے فرائض پورے کریں گے۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر ملک میں اور ہر قوم میں ہدایت دینے والے نبی اور رسول بھیجے فرمایا:۔

اِنَّمَا اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ۔ (سورہ رعد ۷) "تم خبردار کرنے والے ہو اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی ہے"۔ اللہ کی ہدایت دو اجزاء پر مشتمل ہوتی ہے:۔ کتاب ہدایت اور عملی انطباق بتانے والی سنتِ رسول۔ قدیم زمانہ سے اللہ تعالیٰ مختلف قوموں میں کتاب اور رسول دونوں بھیجتا رہا۔ آخری کتاب ہدایت قرآن مجید ہے۔ اور آخری مستند نمونہ ہدایت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔ آج ہدایت الٰہی صرف قرآن مجید سے اور سنّتِ رسولؐ سے مل سکتی ہے۔

یہ ہدایت انسانی ذہن کی ساختہ پرداختہ نہیں ہے۔ یہ ہدایت علیم و خبیر خدائے بزرگ و برتر نے براہ راست حضرت جبریل علیہ السّلام کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمائی ہے۔ یہ ہدایت ان تمام ضروری علوم و معارف کا ذخیرہ ہے، جس کی نوع انسانی کو ضرورت ہے اور جو عقل انسانی کی دسترس سے بالا ہے۔ اس ہدایت کو آئے ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس ہدایت نے عالمِ انسانیت کو ہزارہا انعامات دیے ہیں۔ عالمِ انسانیت اس ہدایت سے مختلف طریقوں سے مستفید اور متمتع ہوتی رہی ہے۔ رحمتِ عالمؐ کا فیضان عام رہا ہے۔ وہ اقوام جو ان پر ایمان لائیں وہ بھی اور وہ اقوام جو ان پر ایمان نہیں لائیں وہ بھی، دونوں رحمتِ عالمؐ اور ہادئ اعظمؐ کی لائی ہوئی تعلیمات سے فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔ اس سرچشمۂ ہدایت سے ان چودہ صدیوں میں جو فیض جاری ہوا ہے اُس کا ہم مختصر سا جائزہ لیتے ہیں۔ انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا تو بڑا دقت اور محنت طلب ہے۔ ہم تو صرف چند عنوانات کے تحت اسلام کے احسانات کا تذکرہ کرتے ہیں۔

انسانی عظمت | ۱۔ اسلام سے قبل انسان ہر جگہ ذلیل و خوار تھا۔ شرک و بت پرستی نے ہر جگہ انسان کی تذلیل

کر رکھی تھی۔ کہیں وہ مٹی اور پتھر کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو رہا تھا۔ کہیں اپنے جیسے گوشت پوست کے انسانوں کو خدائی کے تخت پر بٹھا کر ان کے سامنے عجز و نیاز سے اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔ اسلام نے انسان کو شرفِ انسانیت سے آگاہ کیا۔ اس کو خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کا احساس دلایا۔ ساری مخلوقات کے مقابلے میں اس کو اپنی عزتِ نفس کا شعور دلایا۔ شرک و بت پرستی کے خلاف اسلام نے اس زور و شور سے صور پھونکا کہ قصرِ بت پرستی میں زلزلہ آگیا اور بت پرست خود بت شکن بن گئے۔

اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر شنکر اچاریہ نے ہندوستان میں مورتی کھنڈت کا زبردست پرچار کیا۔ جس کے بعد کبیر پنتھی اور نانک پنتھی جیسے فرقے ہندوؤں میں پیدا ہوئے۔ جو بت پرستی کے شاید مخالف ہیں جو شرک کا رد کرتے ہیں اور توحید کا دم بھرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیمات سے متاثر ہو کر، بلکہ قرآن مجید کا ترجمہ پڑھ کر مارٹن لوتھر نے کیتھولک مذہب کے خلاف بغاوت کی، پوپ کے خلاف اور بت پرستی کے خلاف جہاد شروع کیا اور مسیحیت کا وہ ایڈیشن تیار کیا جس میں بت پرستی بالکل نہیں ہے۔

۲ ــــ مسیحی دنیا میں انسان کے پیدائشی گنہگار (ORIGINAL SIN) ہونے کا عقیدہ رائج تھا کتنی ہی بڑی نیکی ہو اُس گناہ کو زائل نہیں کر سکتی تھی۔ ہندو دنیا میں پیدائشی بدی (شودر) کے عقیدہ کے ساتھ ساتھ پیدائشی نیکی (برہمن) کا عقیدہ بھی رائج تھا۔ جس کے بعد نیکی اور بدی کا سب عمل بیکار تھا۔ اس طرح نیک اعمال اور حسنِ کردار کی جانب سے ہر جگہ غفلت تھی۔ اسلام نے ان باطل عقیدوں کی تردید کی نجات کا بھی اور ہلاکت کا بھی دارومدار اعمال پر بتایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کے ماں باپ ہیں جو اس کو یہودی، عیسائی اور مجوسی بنا لیتے ہیں"۔ پیدائشی گنہگار ہونے کا تصور قطعاً باطل ہے۔ اسی خیال کو علامہ اقبالؒ نے اپنے شعر میں پیش کیا ہے ؎

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

۳ ــــ اسلام نے دنیا کو انسانی جان کا احترام سکھایا۔ اسلام سے قبل ساری دنیا میں قتلِ اطفال، خصوصاً قتلِ بنات کا رواج عام تھا۔ لوگ لڑکی کی پیدائش کو عار سمجھتے تھے۔ اسلام نے اس رسم قبیح کو سختی سے ختم کر دیا۔ آج دنیا کو تسلیم ہے کہ دنیا سے قتلِ اطفال کی لعنت کا انسداد نبی عربیؐ کی تعلیمات کا نتیجہ ہے دائرۃ المعارف مذہب و اخلاق میں درج ہے:۔

AS A MORAL REFORMER MOHAMMAD HAS TO HIS

CREDIT THE ABOLITION OF INFANTICIDE

(ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS-VOL VIII P.576)

۴ ــــ یہ اسلام ہے جس نے سب سے پہلے خودکشی کو حرام قرار دیا اور کہا کہ یہ بزدلی ہے اور کارزارِ حیات سے راہ فرار ہے۔ ورنہ آج بھی کتنے ہی نام نہاد دانشور ایسے ہیں جو خودکشی کو جائز سمجھتے ہیں۔

۵ ــــ اسلام نے بجز عدالتی چارہ جوئی کے کسی دوسری صورت میں قتلِ انسانی کی اجازت نہیں دی ہے۔ اور انسانی جان کو انتہائی محترم قرار دیا ہے۔ اقبالؒ کہتے ہیں:-

ــــ آدمیت، احترامِ آدمی باخبر شو از مقامِ آدمی

فسطائی نظام ہائے فکر میں افراد کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ وہ معاشرہ کی مشین میں ایک غیر اہم پرزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فسطائی حکمران انسانوں کو قتل کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے۔ ہٹلر نے چھ لاکھ یہودیوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے قتل کرایا تھا۔ روس میں اجتماعی کاشتکاری کی اسکیم کے نفاذ کے موقعہ پر اسٹالن نے پندرہ ۱۵ لاکھ انسانوں کو لقمۂ اجل بنا دیا۔ ماؤزے تنگ کے حکم سے پیکنگ سے لہاسہ (تبت) تک ریل کی پٹری بچھانے میں کم از کم پندرہ ہزار مزدور کھپ گئے۔ وہاں انسانوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔ ان کے مقابلے میں اسلام کے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لَوْاَنَّ عَنَاقًا ذَهَبَتْ بِشَاطِئِ الْفُرَاتِ لَاَخَذَ بِهَا عُمَرُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔ یعنی "ساحلِ فرات پہ (انسان تو کجا) اگر بکری کا بچہ بھی ظلم سے مارا جائے گا تو کل قیامت کے روز عمرؓ سے اس کی بازپرس ہوگی" اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام نے احترامِ انسانیت کا کتنا لطیف احساس افراد کے اندر پیدا کر دیا تھا۔

۶ ــــ انسان عقل و فہم، شعور و احساس سے عبارت ہے۔ انسان کو عقل و فہم سے عاری کر دینا درحقیقت اس کو شرفِ انسانیت سے نیچے گرا دینا ہے۔ شراب خوری اور نشہ بازی دراصل عقل و شعور کو زائل کر دینے والا عمل ہے۔ شراب خوری انسانیت کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔ ہزارہا عائلی اور معاشرتی خرابیوں اور تباہ کاریوں کی جڑ نشہ بازی کی علت ہے۔ اسلام نے شرفِ انسانیت کو تحفظ دینے کے لیے نشہ خوری کو حرام قرار دیا ہے۔ آج ساری دنیا اس عیب میں مبتلا ہے۔ مگر مسلمان بڑی حد تک اس علت سے محفوظ ہیں۔ عظیم مؤرخ آرنلڈ ٹائن بی لکھتا ہے۔ "دنیا کی آبادی کا چھٹا حصہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ یہ حصہ شراب خوری

کی لعنت سے بچا ہوا ہے۔ کروڑوں مسلمان ایسے ہیں جنہوں نے نہ شراب کا رنگ دیکھا ہے اور نہ وہ اُس کی بُو سے واقف ہیں"۔ شراب نوشی کی تباہ کاریوں کا احساس دُنیا کو اب ہونا جا رہا ہے مگر اسلام نے چودہ سو سال قبل ہی اس کو حرام قرار دے دیا تھا۔

۷ — جسمانی طہارت اور نفاست کا جو معیار اسلام نے اپنے پیروؤں میں مقرر کیا ہے۔ وہ آج بھی دوسری اقوام میں ناپید ہے۔ افلاس اور ناداری کے باوجود مسلمان زیادہ طہارت پسند ہیں۔ نجاستِ غلیظہ اور نجاستِ خفیفہ، نجاستِ بدنی اور نجاستِ حکمی کا تصور بھی دوسری اقوام میں نہیں ہے۔ اسلامی طریقۂ غسل اور مغربی طریقۂ غسل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

۸ — مذہب اور عقیدہ کی آزادی سب سے پہلے اسلام نے دی ہے۔ قرآن مجید واشگاف الفاظ میں اعلان کرتا ہے:۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (کہف۔۱۹)

"اے نبیؐ - صاف کہہ دو کہ یہ حق ہے تمہارے رب کی طرف سے۔ اب جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر اختیار کرے"۔

دوسری جگہ فرمایا: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ۔۲۵۶)

"دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے صحیح بات غلط افکار سے چھانٹ کر الگ کر دی گئی ہے"۔

اسلام سے قبل کسی مذہبی کتاب میں اور کسی حکیم اور کسی فلسفی کی تعلیمات میں مذہب اور عقیدہ کی آزادی اور رواداری کا سراغ نہیں ملتا۔ یہ اسلام ہے جس نے دنیا کو یہ آزادی بخشی ہے۔ مذہبی اقلیتوں نے جتنا آرام وسکون اسلامی حکومتوں میں پایا ہے، اتنا کسی دور میں اور کسی حکومت میں نہیں پایا۔ مسلمانوں نے جداگانہ ملت قرار دے کر غیر مسلموں کو نہ صرف دین وعقیدہ کی آزادی دی تھی بلکہ اپنی کلچر اور ثقافت کے تحفظ کا بھی حق دیا ہے۔ اس کے برخلاف آج کے دور میں بلند بانگ آزاد خیال اور لادینی ریاستیں اقلیتوں کی ثقافت اور تہذیب کو اکثریت کے رنگ میں مدغم کرنے پر مصر ہیں۔ اس طرح ان کا تہذیبی وجود فنا کر دینا چاہتی ہیں۔

۹ — لادینیت کی بے مقصد زندگی کے مقابلے میں ایمان باللہ کی با مقصد زندگی ہزار درجہ افضل ہے۔ اور ہزار گونہ سکون وطمانیت بخش۔ ایمان باللہ انسان کے ضمیر کے اندر اخلاص عمل اور خود احتسابی

کے جذبہ کو تقویت پہنچاتا ہے۔ رزم گاہِ خیر و شر میں یہ جذبہ انسان کا سب سے قوی ہتھیار ہے۔ ایمان باللہ کے بعد ایک مومن مسلسل اور پیہم اخلاقی اور روحانی ترقی کرتا رہتا ہے۔ عبادات کی پابندی سے انسان کے اندر انضباطِ نفس اور مستقل مزاجی کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ اس کی ہر دم یہ خواہش رہتی ہے کہ حُسنِ عمل اور حُسنِ کردار کا بہتر سے بہتر نمونہ پیش کر کے اپنے ربِ کریم کی رضا حاصل کرے۔

عورت کا وقار

۱۔ اسلام سے قبل عورت نہایت پستی میں تھی۔ نہ اس کی کوئی حیثیت تھی، نہ وہ کسی شے کی مالک بن سکتی تھی۔ ہندوستان میں شوہر کے مرنے کے بعد بیوی کی زندگی اس قدر اجیرن ہو جاتی تھی کہ وہ محض اس سے نجات حاصل کرنے کی خاطر شوہر کے ساتھ جل مرنا پسند کرتی تھی۔ مسیحی دنیا میں بھی عورت کا حال خراب تھا۔ ۳۲۵ عیسوی نیقیہ (NIEACA) ترکی میں پادریوں کی ایک عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی تھی، جس میں فیصلہ کیا گیا تھا کہ عورت انسان نہیں ہے۔ اس کی فطرت داغدار ہے۔ ایران میں عورت کی حالت اور بھی ابتر تھی۔ وہاں محرمات بھی شہوانی تعدی سے محفوظ نہیں تھیں۔ عورت لذت اندوزی کا ایک کھلونا تھی۔ شاہنشاہ دارا اول اپنے باپ بہمن کا بیٹا بھی ہے اور نواسہ بھی۔ مانی کے مذہب نے تو زر، زمین اور زن کو مشترکہ ملکیت قرار دے دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں جتنے جنرل تھے وہ سب ملکہ پوران دخت کے شوہر بن گئے تھے۔ اس وقت کی مہذب دنیا کا یہ حال تھا۔

۲۔ مسیحی دنیا نے عورت کی جداگانہ شخصیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شادی سے قبل وہ باپ کی شخصیت کا جزو ہوتی تھی۔ اور شادی کے بعد وہ شوہر کی شخصیت کا ضمیمہ بن جاتی تھی۔ پہلے وہ مس جانسن کہلاتی تھی۔ اب وہ مسز تھامسن کہلاتی تھی۔

اسلام نے عورت کو مستقل بالذات شخصیت کا مالک قرار دیا۔ شادی سے قبل بھی وہ عائشہؓ اور فاطمہؓ تھی اور شادی کے بعد بھی وہ عائشہ اور فاطمہ رہتی ہے۔ مغربی تہذیب سے متاثر ہو کر آج کل بعض مسلمان عورتیں اپنا نام مغربی طریقہ پر لکھنا پسند کرتی ہیں، مثلاً طاہرہ خورشید۔ ان کم فہموں کو یہ خبر نہیں کہ اس طریقہ سے وہ اپنی مستقل حیثیت کا انکار کر رہی ہیں اور شوہر کی شخصیت کا ضمیمہ بننا قبول کر رہی ہے

۳۔ دنیا میں سب سے پہلے اسلام نے ترکہ میں لڑکے کے ساتھ لڑکی کو بھی حصہ دار مقرر کیا۔ اب اگر مسیحی دنیا اور ہندو دنیا (ہندو کوڈ ۱۹۵۶ء) عورتوں کو وراثت میں شریک کر رہی ہے تو یہ دراصل اسلام کی صدائے بازگشت ہے۔ اسلام نے عورت کو ملکیت رکھنے کا بھی حق دیا ہے جو اس صدی میں اہلِ یورپ ان کو

عطا کر رہے ہیں۔

۴۔ اسلام نے عورت کا درجہ معاشرہ میں اخلاقی اور دینی اعتبار سے بلند کیا۔ عورت کی تین حیثیتیں ہیں ماں، بیوی اور بیٹی۔ ماں کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ماں کی خدمت کرو۔ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے"۔ قرآن مجید کا حکم ہے:۔ "والدین سے اُف بھی مت کہو، ان کو جھڑکو بھی نہیں"۔ بیوی کے متعلق حضورؐ کی حدیث ہے:۔ "تم میں سے بہترین آدمی وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے"۔ بیٹی کی پیدائش کو آج بھی بعض اقوام بُرا سمجھتی ہیں۔ اس سلسلے میں حضورؐ نے فرمایا۔ "جس شخص کے دو بیٹیاں پیدا ہوں اور وہ اُن کی اچھی تعلیم اور تربیت کرے اور پھر اچھی جگہ شادی کردے، تو وہ شخص جنت میں جائے گا"۔ اس کے بعد سے ماں کی اطاعت و فرمانبرداری اور بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک اسلامی معاشرہ کا عام وطیرہ بن گیا۔

(باقی)

نوٹس

(۱)

قارئین ماہنامہ ترجمان القرآن سے التماس ہے کہ اگر کسی کو ماہنامہ کے حساب کتاب کے بارے میں کوئی شکایت ہو تو فوراً مطلع فرمائیں

(۲)

تمام حضرات اپنا نیا خریداری نمبر نوٹ فرمالیں خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

امام بخاریؒ اور خدمتِ حدیث

از ڈاکٹر ابو الفتح محمد صغیر الدین

صدر شعبۂ تقابل ادیان و ثقافت اسلامیہ جامعہ سندھ

امام بخاریؒ کی کنیت ابوعبداللہ ہے اور ان کا نام و نسب یہ ہے: محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بن المغیرہ بن بَرْدِزْبَہ۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ بَرْدِزْبَہ کے تلفظ کے متعلق رقمطراز ہیں کہ اس لفظ میں بائے موحدہ مفتوح، رائے مہملہ ساکن اور دال مہملہ مکسور، زائے معجمہ ساکن اور اس کے بعد بائے موحدہ مفتوح اور آخر میں تائے تانیث موقوف ہے۔ بَرْدِزْبَہ دہقان بخارا کی لغت میں کاشتکار یا کارندہ کو کہتے ہیں۔ نسبتِ ولاء کی وجہ سے ان کو جُعفی کہتے ہیں۔ چونکہ اس زمانہ میں دستور یہ تھا کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا تھا اس کو اس کے قبیلہ کی طرف منسوب کرتے تھے۔ امام بخاری کے جدِ ثانی (پردادا) مغیرہ یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے۔ اس وجہ سے امام بخاری کو بھی جعفی کہنے لگے۔ امام بخاری ۱۳ شوال ۱۹۴ھ کو جمعہ کے دن بعد نماز جمعہ پیدا ہوئے۔ اور عید الفطر کی شب میں عشاء کی نماز کے وقت ۲۵۶ھ میں وفات پائی اور عید کے دن نماز ظہر کے بعد دفن کر دیے گئے۔ کل ۶۲ سال عمر پائی۔ ان کی ولادت عمر اور وفات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ "وُلِدَ فِی صِدْقٍ وَعَاشَ حَمِیْدًا وَمَاتَ فِی نُوْرٍ" یعنی صدق (۱۹۴) ان کا سال ولادت — حمید (۶۲) ان کی عمر اور نور (۲۵۶) ان کا سالِ وفات ہے۔

امام صاحب کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے حدیث کو آسان کر دیا

---

[1] بستان المحدثین مترجم ص ۱۷۷

تھا۔ گویا ان کی تخلیق حدیث ہی کے لیے ہوئی تھی۔ یہ ابھی مکتب ہی میں تھے کہ ان کو حفظ حدیث کا القاء کیا گیا تھا۔ ابو جعفر محمد بن ابی حاتم وراق بخاری کا بیان ہے کہ میں نے امام بخاری سے پوچھا کہ آپ اس شان تک کیسے پہنچے تو انہوں نے جواب میں اپنے حالات اس طرح بیان کیے کہ مکتب ہی کے زمانے میں میرے دل میں حفظِ حدیث کا القا کیا گیا جب کہ میری عمر دس سال یا اس سے کم ہی تھی۔ دس سال کی عمر میں مکتب سے فارغ ہوا تو داخلی وغیرہ کے حلقہ درس میں جانے لگا۔ ایک دن داخلی نے سند بیان کرتے ہوئے فرمایا "سفیان عن ابی الزبیر عن ابراھیم" اس پر میں نے کہا کہ ابو الزبیر نے ابراہیم سے روایت نہیں کی۔ داخلی نے پہلے تو مجھے ڈانٹ دیا تب میں نے کہا کہ اگر اصل آپ کے پاس ہے تو اس کی طرف رجوع فرمائیے۔ چنانچہ داخلی گھر کے اندر گئے اور اصل میں دیکھا، پھر واپس آئے اور مجھ سے پوچھا کہ لڑکے بتاؤ پھر کیا صحیح ہے؟ میں نے کہا زبیر بن عدی ابراہیم سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ داخلی نے قلم مجھ سے لے کر اپنے نسخہ کی اصلاح کر لی اور کہا کہ تم نے صحیح کہا تھا۔ کسی نے امام بخاریؒ سے پوچھا کہ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ تو انہوں نے بتایا کہ اس وقت میری عمر گیارہ سال تھی، پھر فرمایا کہ جب میں سولہ [16] سال کی عمر میں داخل ہوا تو ابن مبارکؒ اور وکیعؒ کی کتابیں یاد کیں اور اصحاب الرائے کے کلام سے واقفیت حاصل کی۔ پھر میں [1] اپنے بھائی احمد اور اپنی والدہ کے ساتھ حج کے لیے روانہ ہوا۔ حج سے فارغ ہو کر میری والدہ اور میرے بھائی تو بخارا واپس چلے گئے اور میں طلبِ حدیث کے لیے مکہ ہی میں رہ گیا۔ جب اٹھارہ سال کی عمر میں داخل ہوا تو کتاب فضائل الصحابہ والتابعین تصنیف کی اور روضۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسی زمانہ میں تاریخِ کبیر تصنیف کی۔ اس میں کوئی نام ایسا نہیں جس کے متعلق مجھے کوئی واقعہ معلوم نہ ہو لیکن کتاب طویل ہونے کے خوف سے میں نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

امام بخاری تحصیلِ حدیث کے سلسلے میں درس حدیث کے مختلف حلقوں میں شامل ہوتے رہے۔ پہلے تو شیوخ بخارا سے ذخیرۂ حدیث جمع کیا، پھر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے مشہور محدثین سے علم حاصل کیا بعد ازاں بلخ، مرو، نیشاپور، رے، بصرہ، کوفہ، بغداد، مصر، دمشق، قیساریہ، عسقلان

۱؎ ارشاد الساری جلد ۱ صفحہ ۲۷

حمص کا سفر کیا اور وہاں کے محدثین سے حدیثیں حاصل کیں۔ اِن علمی رِحلات کے دوران جب کہ آج کی سی سفر کی سہولتیں حاصل نہیں تھیں جن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، اُن کا اندازہ مشکل نہیں۔ تقریباً سولہ سال تک ان رِحلات کا سلسلہ جاری رہا۔ سخت مصیبتیں اٹھائیں، بھوک پیاس کی شدت برداشت کرنی پڑی۔ لیکن علمِ حدیث کا شوق انہیں کشاں کشاں لیے پھر رہا تھا۔ اس طرح جن محدثین سے امام صاحب نے حدیث کا علم حاصل کیا، ان کی تعداد ایک ہزار اسّی ۱۰۸۰ بیان کی جاتی ہے۔

علمِ حدیث کے میدان میں امام صاحب کے کارناموں کا اندازہ کرنے اور آپ کا مقام متعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس علم کے ارتقائی ادوار پیش نظر رہیں۔

حدیث کے جمع و تدوین کی ابتداء اگرچہ ۹۹ھ سے ہوئی۔ لیکن احادیثِ نبویؐ کا قلمبند کیا جانا عہدِ نبویؐ ہی سے پایۂ تحقیق کو پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا "الصحیفۃ الصادقۃ" کے نام سے احادیث کا جمع کرنا ثابت ہے۔ نیز صحیفہ ہمّام بن مُنَبّہ (المتوفی ۱۰۲ھ) بھی ہے جس کو ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب نے ۱۹۵۵ء میں ایڈٹ کر کے حیدر آباد دکن سے شائع کیا ہے۔ یہ وہ صحیفہ ہے جس کو حضرت ابو ہریرہؓ نے اپنے شاگرد ابو عقبہ ہمّام بن مُنَبّہ کے لیے مرتب کیا تھا۔ اس طرح حفظِ حدیث اور یادداشتوں کے تحفّظ کا سلسلہ عہدِ رسالت ہی میں شروع ہوگیا تھا۔ اور خاص خاص حضرات نے اسی عہد میں احادیث لکھی تھیں۔ لیکن ان کی نوعیت باقاعدہ تصنیف کی نہیں تھی۔ بوجوہ چند خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کی طرف توجہ نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ بنو امیہ کے ابتدائی عہد میں بھی یہی حال رہا۔ جب حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا زمانہ آیا تو انہوں نے مدینہ کے گورنر کو حدیثوں کے قلمبند کرنے کا حکم دیا۔ جیسا کہ مؤطا امام محمدؒ میں مذکور ہے کہ:-

ان عمر بن عبد العزیز کتب الی ابی بکر بن محمد بن عمرو بن حزم، ان انظر ما کان من حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم أو سنتہ فاکتبہ فانی خفت دروس العلم وذھاب العلماء واوصاہ ان یکتب لہ ما عند عمرۃ بنت عبد الرحمن الانصاریہ والقاسم

بن محمد بن ابی بکر[۱]

(یعنی حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابوبکر بن محمد بن عمرو بن حزم کو لکھ بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی بھی احادیث تم کو ملیں سب کو قلمبند کر لو، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ دنیا سے علماء کے اٹھتے چلے جانے کے سبب کہیں علم دین مٹ نہ جائے اور اس کی بھی فرمائش کی کہ عمرہ بنت عبدالرحمٰن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے پاس جو کچھ ہے۔ اس کو بھی ان سے لے کر لکھ لیں)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس حکم کے بعد تالیف و تدوین کا کام شروع ہو گیا اور ہر شہر کے علماء اس کام میں مشغول ہو گئے۔ مدینہ منورہ میں مالک بن انس (م ۱۷۹ھ) مکہ معظمہ میں ابن جریج (م ۱۵۰ھ) بصرہ میں ربیع بن صبیح (م ۱۶۰ھ)، سعید بن ابی عروبہ (م ۱۵۶ھ) اور حماد بن سلمہ (م ۱۷۶ھ) نے کوفہ میں سفیان ثوری (م ۱۶۱ھ) نے، شام میں اوزاعی (م ۱۵۶ھ) نے، یمن میں معمر (م ۱۵۳ھ) نے، مصر میں لیث بن سعد (م ۱۷۵ھ) نے اور خراسان میں ابن مبارک (م ۱۸۱ھ) نے اور اسی طرح دیگر مقامات میں لوگوں نے حدیثیں جمع کرنا شروع کیں۔

یہ تمام حضرات ہم عصر ہیں، اس لیے یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ان میں سے کس نے سب سے پہلے جمع کیا لیکن چونکہ ابن جریج کا انتقال مکہ میں ۱۵۰ھ میں ہوا اس لیے اگر ان کو مقدم کیا جائے تو یہ قرینِ قیاس ہے۔

غرض اس جمع و تدوین کا کام دوسری صدی ہجری کے نصف اول سے شروع ہوا۔ ان جامعینِ حدیث میں بعضوں نے حدیثیں تو جمع کر دیں لیکن ان میں صحیح حدیث کا التزام نہیں کیا، بلکہ جو حدیث ملی اس کو درج کر لیا۔ اور بعضوں نے صحیح حدیثیں درج کیں۔ لیکن ان کے ساتھ اقوالِ صحابہ اور تابعین کے فتاویٰ بھی درج کر دیے۔ بعضوں نے احادیث کو مضامین کے لحاظ سے ترتیب دیا۔ اور بعضوں نے اس طرح ترتیب قائم کی کہ ہر صحابی کی جملہ مرویات کو بلالحاظ مضمون یکجا ذکر کر دیا[۲]

---

[۱] موطا امام محمد۔ الکتاب علم، ص ۳۸۹ بخاری تعلیقاً (کتاب العلم، باب کیف یقبض العلم۔

[۲] الرسالۃ المستطرفہ (محمد بن جعفر الکتانی) صفحہ ۱۰

اِن ابتدائی تصنیفات میں سے ہم تک ایک کتاب موطا امام مالکؒ پہنچی ہے، جس کی ترتیب فقہی طرز پر ہے، لیکن سند کے لحاظ سے موطا امام مالک کی تمام حدیثیں متصل نہیں ہیں، کیوں کہ اس میں مرسل روایتیں بھی ہیں جن میں تابعی کسی صحابی کا نام ذکر کیے بغیر کہہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ایسا فرمایا۔ بعض حدیثیں منقطع بھی ہیں کہ جن کی سند میں درمیان سے ایک یا زیادہ راوی ساقط ہو گئے ہیں۔ اور اس میں بلاغات بھی ہیں جن میں امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ مجھے فلاں شخص سے یا ایک ثقہ شخص سے حدیث پہنچی ہے۔

اس طرح علم حدیث تدوین و ترتیب کے مراحل طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ صحاح ستّہ کے مصنّفین تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں منظر عام پر آئے، جنہوں نے ایسی کتابیں ترتیب دینے کی کوشش کیں جن میں صحیح اور مرفوع حدیثیں ہوں اور سند کے اعتبار سے بے داغ ہوں۔ ان میں امام بخاریؒ شرف و فضل اور تقدمِ زمانی کے لحاظ سے سرفہرست ہیں۔

ان حضرات کا مقصد یہ تھا کہ صرف صحیح حدیثیں ذکر کی جائیں اور ضعیف حدیثیں ترک کر دی جائیں۔ لیکن صحیح اور ضعیف میں امتیاز کرنا انتہائی دشوار کام تھا۔ کیونکہ اس کے لیے راویانِ حدیث کے حالاتِ زندگی، ولادت اور تاریخِ وفات وغیرہ کا جاننا بہت ضروری تھا تاکہ معلوم ہو سکے کہ راوی کی ملاقات اپنے شیخ سے ہوئی ہے یا نہیں، اور راوی قابلِ اعتماد ہے یا نہیں۔ مزید برآں اب نئے حالات پیدا ہو چکے تھے اور مختلف سیاسی اور معاشی اسباب کی بنا پر وضعِ احادیث کا فتنہ شدت سے پیدا ہو چکا تھا۔ اور بعض راوی جھوٹ گھڑنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس کا ہلکا سا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک دن امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے مسجد رصافہ میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد ایک قصہ گو کھڑا ہوا اور ایک حدیث بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہم سے احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے بہ سند عبدالرزاق، معمر، قتادہ، حضرت انسؓ سے یہ روایت بیان کی ہے۔ امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے پوچھا کہ کیا تم نے یہ حدیث بیان کی ہے؟ دونوں کہنے لگے کہ خدا کی قسم میں نے یہ حدیث تو اسی وقت سُنی ہے۔ جب وہ قصہ گو قصے سے فارغ ہوا اور حاضرین سے انعام وصول کر چکا تو انعام کی اُمید میں یحییٰ بن معین کے قریب آیا۔ یحییٰ نے

اُس سے پوچھا کہ تجھ سے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے ؟ اُس نے جواب دیا کہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین نے۔ یحییٰ نے کہا کہ یحییٰ بن معین تو میں ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں۔ ہم لوگوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں سُنی۔ اگر تجھ کو جھوٹ ہی بولنا تھا تو کسی اور کے متعلق بول لیا ہوتا۔ اُس نے پوچھا کیا تم یحییٰ بن معین ہو ؟ یحییٰ نے جواب دیا ہاں ! وہ بولا کہ میں ہمیشہ سے سُنتا آیا تھا کہ یحییٰ بن معین احمق ہے اور اسی وقت اس کی تصدیق ہو گئی۔ یحییٰ نے پوچھا تو نے کیسے سمجھ لیا کہ میں احمق ہوں ؟ اُس نے جواب دیا کہ کیا دُنیا میں تمہارے علاوہ کوئی اور یحییٰ بن معین اور احمد بن حنبل نہیں ہیں ؟ میں نے تو سترہ احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین سے روایت لکھی ہے امام احمدؒ نے ہنستے ہوئے اپنی آستین اپنے منہ پر رکھ لی۔ اور یحییٰ بن معین سے فرمایا کہ اسے جانے دو اور وہ کھڑا اُن دونوں کا مذاق اُڑاتا رہا۔[1]

غرض ان حالات میں کام بہت مشکل تھا لیکن اس کو انجام دینا بھی ضروری تھا کیونکہ یہ ایک دینی ضرورت تھی۔ چنانچہ ایک دن اسحٰق بن راہویہ (متوفی ۲۳۸ھ) نے اپنے حلقۂ درس میں شاگردوں سے کہا۔ "کاش تم لوگ ایک مختصر مجموعہ تیار کرتے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کو صحیح کر دے"۔ اس حلقۂ درس میں امام بخاری بھی شریک تھے۔ اُستاد کے اس جملہ نے مہمیز کا کام کیا اور امام بخاری کو اس ضرورت کا احساس ہوا۔ نیز امام صاحب نے بعض خواب بھی ایسے دیکھے جن میں اس کام کی طرف اشارۂ غیبی سمجھا۔ ایک مشہور خواب یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے خواب میں دیکھا کہ وہ مورچھل لیے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور سے مکھیاں دفع کر رہے ہیں۔ تعبیر یہ ہوئی کہ تم سے جھوٹی احادیث کی تنقیح کا کام لیا جائے گا۔ ان محرکات کی بنا پر امام صاحب اس کٹھن کام کے لیے آمادہ ہو گئے۔ لیکن اس کام کے لیے دو قسم کی صلاحیتیں از بس ضروری تھیں اوّل قوتِ حافظہ، دوسرے نقدِ رجال میں مہارت۔ اور قدرت نے اُن کو ان دونوں صلاحیتوں کے عطا کرنے میں انتہائی فیاضی سے کام لیا تھا۔

قوتِ حافظہ کا یہ حال تھا کہ حاشد بن اسمٰعیل جو امام بخاری کے زمانہ کے محدث ہیں بیان کرتے

---

[1] تذکرۃ الموضوعات (ملا علی قاری) مترجم صفحہ ۶۵ ۔ مشیر

ہیں کہ بخاری طلب حدیث کے لیے میرے ساتھ شیوخ کی خدمت میں آمد و رفت رکھتے تھے لیکن اُن کے پاس لکھنے کا سامان کچھ نہ ہوتا تھا اور نہ وہ کچھ لکھتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ جب تم حدیثیں لکھتے نہیں تو آنے جانے سے کیا فائدہ؟ سولہ دن کے بعد امام بخاریؒ نے کہا کہ تم لوگوں نے مجھے پریشان کیا، اب میری یاد کا اپنے نوشتوں سے مقابلہ کرو۔ اس مدت میں ہم نے پندرہ ہزار حدیثیں لکھی تھیں، امام بخاریؒ نے تمام حدیثیں اس طرح سنائیں کہ میں خود اپنی لکھی ہوئی حدیثوں کو اُن سے صحیح کرتا تھا۔[1]

اور سب سے حیرت انگیز واقعہ تو بغداد کا ہے کہ امام بخاریؒ بغداد پہنچے تو علمائے شہر نے ان کے امتحان کا فیصلہ کیا۔ دس آدمی منتخب ہوئے۔ اُن میں سے ہر ایک نے دس دس حدیثیں سنائیں اور ہر حدیث کی سند اور متن میں اُلٹ پلٹ کر دیا۔ امام صاحب یہ حدیثیں سنتے رہے اور کہتے جاتے کہ مجھے معلوم نہیں۔ جب سب اپنی اپنی حدیثیں سنا چکے تو امام صاحب اسی ترتیب کے ساتھ ہر ایک کو جواب دیتے گئے۔ پہلے شخص کو بُلا کر کہا کہ تمہاری پہلی حدیث کے سند اور متن میں یہ غلطی ہے اور دوسری حدیث کے سند اور متن میں یہ غلطی ہے اس طرح ان سَو احادیث کے متن اور سند کی اصلاح ترتیب وار فرمائی۔[2]

نقد رجال میں امام صاحب کی مہارت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کبیر تاریخ صغیر اور تاریخ اوسط جیسی کتاب لکھی جس کی وجہ سے سینکڑوں افترا پردازوں کے راز فاش ہوئے اور ہزاروں غلط واقعات کی قلعی کھل گئی۔ اسی طرح اس فن کے ذریعے احادیث کے علل[3] معلوم ہوئے۔ امام صاحب کو علل کی دریافت میں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ جامع ترمذی میں جس قدر میں نے حدیثوں کی علتیں بیان کی ہیں یا رجال یا تاریخ میں کلام

---

[1] ارشاد الساری ج ۱ ص ۲۸ [2] ایضاً ص ۲۹

[3] علل علمِ حدیث میں ان اسباب کو کہتے ہیں جو پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن اُن کی وجہ سے حدیث کی صحت اور قبولیت میں نقص پیدا ہوتا ہے۔ حالانکہ حدیث بظاہر ہر طرح صحیح و سالم ہوتی ہے۔

کیا ہے ۔ اس کا اکثر حصہ امام بخاری کی تاریخ سے لکھا ہے [1]۔ نیز فرمایا کرتے تھے کہ میں نے علل و اسانید کا امام بخاری سے زیادہ عالم کسی کو نہیں دیکھا [2]

ایک بار علامہ محمد بن یوسف فریابی نے لوگوں کے سامنے ایک حدیث بیان کی جس کی سند یہ تھی: "سفیان عن ابی عروبہ عن ابی الخطاب عن ابی حمزۃ ۔ حاضرین میں سے کوئی بھی سفیان کے اوپر کے راویوں کو نہیں سمجھ سکا ۔ اس لیے کہ سب کنیت کے ساتھ مذکور تھے ۔ امام بخاری نے اسی وقت عرض کیا کہ ابو عروبہ تو معمر بن راشد ہیں ، ابو الخطاب سے مراد قتادہ ہیں اور ابو حمزہ انس بن مالک ہیں اور یہ کہہ کر عرض کیا کہ سفیان مشہور راویوں کو کنیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں [3]

امام بخاری بے پناہ قوتِ حافظہ کے مالک تھے ۔ زہد و تقویٰ کی صفات سے متصف تھے ۔ اور نقدِ رجال میں اُن کی مہارت اس قدر مسلم تھی کہ جس شخص کے متعلق انہوں نے کہہ دیا کہ یہ شخص منکر الحدیث ہے تو محدثین اُس سے روایت کو حلال نہیں سمجھتے تھے ۔ اور جس راوی کو اُن کی کتاب میں جگہ مل گئی تو اُس کا بیڑا پار ہوگیا ۔ ان صلاحیتوں کے ساتھ امام بخاری اپنی "صحیح" کی تالیف کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنی حفظ کی ہوئی چھ لاکھ احادیث میں انتخاب کر کے صحیح بخاری مرتب کی اور اس مجموعہ کا نام الجامع المسند الصحیح المختصر من اُمورِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وَسُنَنِہٖ وَ اَیَّامِہٖ رکھا ۔ ہر حدیث کے انتخاب میں پورے احتیاط سے کام لیا ۔ ہر حدیث کو مکمل طور سے جانچا ، ہر حدیث کی تخریج سے پہلے غسل کیا اور دو رکعت نمازِ استخارہ پڑھی ، اس اہتمام کے ساتھ پوری کتاب لکھی ، کتاب مکہ معظمہ میں تالیف کی اور اس کے تراجم ابواب ، مدینہ منورہ میں روضۂ شریف اور منبرِ نبوی کے درمیان درج کیے ۔ پھر امام صاحب نے اپنی تالیف کو بڑے بڑے نقادانِ فن مثلاً امام احمد بن حنبل ، یحییٰ بن معین ، علی بن مدینی اور ان کے معاصرین کے سامنے پیش کیا ۔ ان لوگوں نے ایک ایک حدیث جانچ کر اُس کی صحت پر اتفاق کیا ۔ امام بخاریؒ سے بلا واسطہ اس کتاب کو پڑھنے والے نوے ہزار ہیں ۔ اس حیثیت سے امام بخاریؒ کے وصال کے بعد اُن کی کتاب کو متواتر

---

[1] کتاب العلل (للترمذی) صفحہ ۲۵۸ [2] ایضاً صفحہ ۲۵۹

[3] ارشاد الساری جلد ۱ صفحہ ۲۹

کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم اپنی کتاب تدوینِ حدیث (صفحہ ۲۷۹) میں لکھتے ہیں:۔

"بخاری میں بعض روایتوں کو ثلاثیات بخاری کہتے ہیں۔ یہ اُن روایتوں کا نام ہے جن میں امام بخاری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کل تین آدمیوں کا واسطہ ہوتا ہے۔ مولانا بحر العلوم نے ان ثلاثیات ہی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ بخاری کے بعد تو اُن کی کتاب متواتر ہوگئی، اس لیے بخاری کے بعد ان سارے ثلاثیات کی حیثیت ہر مسلمان کے لیے رباعیات کی ہوگئی ہے۔"

مولانا بحر العلوم کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ومن ثمہ کان ثلاثیات البخاری رباعیات لنا لان صحیحہ متواتر عنہ فکانا سمعنا من البخاری فلم یزد الا واسطۃ و ھی نفسہ" (فواتح الرحموت جلد۲ صفحہ ۱۹)

گویا یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم نے اس کتاب کو براہ راست امام بخاری سے سُنا ہے کیونکہ ان کے بعد یہ کتاب گویا متواتر ہوگئی ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں جن شرطوں کا لحاظ رکھا ہے اُن کا ذکر امام بخاری نے خود تو نہیں کیا ہے، لیکن جن حضرات نے اس کا غور سے مطالعہ کیا ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب نے کن کن شرطوں کا لحاظ رکھا ہے۔ قسطلانی شارحِ بخاری نے مقدمہ فتح الباری سے مختصراً اس سلسلہ میں جن شرائط کو نقل کیا ہے۔ اُن میں سے اہم یہ ہیں:۔

۱۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ دونوں نے ان ہی حدیثوں کو ذکر کیا ہے جو درجہ اوّل کی ہوں اور اوّل درجہ کی حدیث یہ ہے کہ کسی مشہور صحابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی ہو اور اس کے دو ثقہ راوی ہوں، پھر صحابی سے کسی مشہور تابعی نے روایت کی ہو اور اس کے دو ثقہ راوی ہوں، پھر اسی طرح تبع تابعین نے تابعی سے روایت کی ہو، اس کے بعد امام بخاریؒ و مسلمؒ کے وہ شیوخ ہیں جو حفظ و اتقان میں مشہور ہیں۔ اگرچہ یہ شرط بعض صحابہ کے سلسلے میں قائم نہیں رہی ہے۔ لیکن صحابہؓ کے مابعد کے طبقات میں اس کا لازماً اہتمام کیا ہے۔ کیونکہ اس کتاب کی اصل میں

کوئی حدیث ایسی نہیں جس کو صرف ایک ہی راوی تنے نقل کیا ہو۔

۲ — امام بخاری اور مسلم دونوں نے یہ شرط رکھی ہے کہ ان ہی احادیث کو ذکر کیا جائے جن کے راویوں پر مکمل طور پر اعتماد ہو اور صحابی تک جتنے راوی ہیں اُن کے ثقہ ہونے پر سبھوں کا اتفاق ہو ان کا سلسلۂ اسناد متصل ہو کہیں سے منقطع نہ ہو۔ اگر صحابی کے دو یا زیادہ راوی ہوں تو زیادہ اچھا ہے۔ ورنہ اگر صرف ایک ہی راوی ہو تو سند صحیح طریقے سے وہاں تک پہنچتی ہو تو کافی ہے۔ امام بخاری نے بہت سے لوگوں کی روایات کو شبہ کی بنا پہ ترک کر دیا لیکن امام مسلم نے شبہ زائل ہونے کے بعد ان کی حدیثوں کو لے لیا ہے۔

۳ — ایک اور کڑی شرط جس کا امام بخاریؒ نے لحاظ رکھا ہے وہ یہ ہے کہ "معنعن" روایتوں میں اتصالِ سند کے لیے وہ صرف معاصرت کو کافی نہیں سمجھتے بلکہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ ملاقات بھی ثابت ہو۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ محدثین حدیث نقل کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتے ہیں۔ ابن الصلاح نے اپنی کتاب علوم الحدیث میں جو مقدمہ ابن الصّلاح کے نام سے مشہور ہے اس کی آٹھ صورتیں بیان کی ہیں، جن میں پہلی صورت تو یہ ہے کہ خود شیخ سے سنا جائے، خواہ وہ املا کرائے یا بغیر املا کے حدیث بیان کرے۔ زبانی ہو یا کسی کتاب سے پڑھ کر سنائے۔ جمہور محدثین کے نزدیک یہ صورت سب سے اعلیٰ و ارفع ہے اور اس صورت کو بیان کرنے کے لیے سننے والا اگر حدثنا، انبانا، سمعت فلانا یقول، قال لنا فلان، ذکر لنا فلان کے الفاظ سے ظاہر کرے تو عیاض بن موسیٰ السبتی کے قول کی بناء پر بلا کسی اختلاف کے جائز ہے۔ حافظ ابوبکر خطیب کہتے ہیں کہ سب سے ارفع عبارت "سمعت" ہے، یعنی میں نے سنا پھر حدثنا اور حدثنی (یعنی ہم سے فلاں نے حدیث بیان کی) ہے۔ بعد میں محدثین اخبرنا کا لفظ صرف اس صورت میں استعمال کرنے لگے جبکہ شاگرد شیخ کے سامنے پڑھے اور شیخ سنے۔

گویا ان تمام الفاظ میں راوی صراحت کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ مجھ سے فلاں نے حدیث بیان کی، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے مروی عنہ سے یا یوں کہیے کہ شاگرد نے استاد سے ملاقات کی ہے۔

لہ مقدمہ ابن صلاح صفحہ ۵ تا ۷

جبھی تو استاد نے شاگرد سے حدیث بیان کی۔ اس لیے یہ سند متصل ہے لیکن اگر یہ صورت ہو کہ راوی اس کی صراحت نہیں کرتا ہے کہ مجھ سے فلاں نے حدیث بیان کی بلکہ وہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ زید عن عمرو عن بکر یعنی زید نے عمرو سے اور عمرو نے بکر سے روایت کیا تو محدثین اس قسم کی روایت کو معنعن کہتے ہیں۔ اس قسم کی روایتوں میں اتصالِ سند کے لیے امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ایک کی ملاقات دوسرے سے ثابت ہو۔ لیکن امام مسلم فرماتے ہیں کہ اگر دونوں معاصر ہوں تو اس معاصرت کی بنا پر سند کو متصل سمجھا جائے گا۔ امام مسلم نے اگرچہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں اس پر بحث کی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں اور امام بخاری کے مسلک کی تردید میں پورا زور صرف کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ معنعن روایتوں کے سلسلے میں امام بخاریؒ کا موقف زیادہ قوی ہے۔

ان سخت شرطوں کی پابندی اور اپنے وضع کردہ طریقۂ کار کی وجہ سے امام بخاری کی کتاب صحیح بخاری کو امت مسلمہ سب سے زیادہ صحیح کتاب تسلیم کرتی ہے اور اس کے بعد صحیح مسلم کا درجہ ہے۔

شاہ ولی اللہ کتب حدیث کے طبقات کے بیان میں فرماتے ہیں:۔

"صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے متعلق محدثین متفق ہیں کہ ان میں تمام کی تمام متصل اور مرفوع احادیث یقیناً صحیح ہیں اور یہ دونوں کتابیں اپنے مصنفین تک بالتواتر پہنچتی ہیں اور جو ان کی عظمت نہ کرے وہ مبتدع ہے اور مسلمانوں کی راہ کے خلاف چلتا ہے۔"[۱]

ابن خلدون نے صحیح بخاری کے متعلق کہا ہے کہ:۔

"میں نے اپنے اکثر شیوخ کو فرماتے ہوئے سنا کہ کتاب بخاری کی شرح امت پر قرض ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ امت کے کسی عالم نے کماحقہ اس کی شرح نہیں کی ہے۔"[۲]

امت اس قرض کو ادا کر سکی یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ علمائے امت نے کتاب اللہ کے بعد سب سے زیادہ جس کتاب کی طرف اپنی توجہ مبذول کی وہ یہی صحیح بخاری ہے۔

---

[۱] حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل صفحہ ۲۲۸

[۲] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۳۸۷

امام ابن تیمیہؒ

سنہ ۶۶۱ھ تا ۷۲۸ھ

از جناب عبد الرشید عراقی

امام ابن تیمیہ کی جامع الصفات شخصیت بلاشبہ ملّتِ اسلامیہ کے لیے سرمایہ صد افتخار ہے۔ آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ آپ نے اسلامی تعلیمات کو خالص کتاب اللہ اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیاد پر پیش کیا۔ وہ تمام آلودگیاں جو یونانی افکار و خیالات کے زیر اثر اسلامی تعلیمات میں راہ پا رہی تھیں یا عجمی مذہبیت کی حامل وہ صوفیانہ تعبیرات جو نیکی اور تقدس کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھیں امام نے ان سب کی تردید کی اور ان کی حقیقت کو بے نقاب کیا۔[1]

امام ابن تیمیہ کا زمانہ بڑا پر آشوب اور پر از واقعات ہے۔ سیاسی، اجتماعی، اخلاقی، علمی اور دینی حیثیت سے یہ دور خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ابن تیمیہ کی اصلاحی جدوجہد اور اُن کے علمی و اصلاحی مزاج کو سمجھنے کے لیے اُس ماحول کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے جس میں ان کا نشو و نما ہوا اور جس میں انہوں نے اپنا تجدیدی و اصلاحی کام انجام دیا۔[2]

امام ابن تیمیہ کون تھے؟ اسلام کی سربلندی کے لیے آپ نے کیا کیا خدمات سرانجام دیں؟ فضائل و اخلاق میں آپ کا کیا رتبہ تھا؟ اور علامہ شبلی نعمانی نے یہ کیوں فرمایا کہ:۔

"اسلام میں سینکڑوں، ہزاروں، بلکہ لاکھوں علماء، فضلاء، مجتہدین، ائمہ فن

---

[1] امام ابن تیمیہؒ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق۔ مطبوعہ اسلامک پبلشنگ ہاؤس لاہور صفحہ نمبر ۴

[2] تاریخ دعوت عزیمت از مولانا ابو الحسن علی ندوی جلد دوم مطبوعہ نشریاتِ اسلام کراچی صفحہ نمبر ۲۵

اور مدبرین گذرے لیکن مجدد یعنی ریفارمر بہت کم پیدا ہوئے۔

مجدد کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں:

۱۔ مذہب یا علم سیاست میں کوئی مفید انقلاب پیدا کر دے۔

۲۔ جو خیال دل میں آیا ہو، کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو، بلکہ اجتہادی ہو۔

۳۔ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں، جان پر کھیلا ہو اور سرفروشی کی ہو۔

تیسری شرط اگر ضروری قرار نہ دی جائے تو امام ابو حنیفہؒ، امام غزالیؒ، امام رازیؒ شاہ ولی اللہؒ صاحب اس دائرہ میں آسکتے ہیں۔ لیکن جو شخص ریفارمر (مجدد) کا اصلی مصداق ہوسکتا ہے، وہ علامہ ابن تیمیہؒ ہیں۔

مجدد کی اصلی خصوصیتیں جس قدر علامہ کی ذات میں پائی جاتی ہیں، اس کی نظیر بہت کم مل سکتی ہے[1]

علامہ شبلی نعمانیؒ کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور نے جن کی دینی خدمات محتاج تعارف نہیں ہیں، امام ابن تیمیہؒ کے مناقب اور ان کی مجددانہ کارناموں سے برصغیر کے علم دوست مسلمانوں کو روشناس کرایا۔

آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں جب دعوتِ عامۂ امت، تجدید شریعت و احیاء السنۃ بعد موتہا و اخماد البدعۃ بعد شیوعہا و ارتفاعہا کی روح القدس نے آیۃ من آیات اللہ وحجۃ قائمۃ من حجج اللہ، شیخ المصلحین و ملاذ المجددین، سند الکاملین، امام العارفین، وارث الانبیاء وقدوۃ الاولیاء حضرت شیخ الاسلام ابن تیمیہ کے وجود مبارک میں ظہور کیا۔ اور عہد اواخر کے تمام مسالکِ دعوتِ تجدید کی ریاست و خاتمیت و قطبیت و مرکزیت کا مقام اس مجدد اعظم کے سپرد کیا گیا۔ دیار مصر و شام علمائے کاملین سے مملوء و مشحون تھے۔ بڑے بڑے حفاظ و نقادِ علوم اور غواص و اعاظمِ نظرِ اجتہاد موجود تھے۔ جن کے بعد اس درجہ کے لوگ تمام عالمِ اسلامی میں پیدا نہیں ہوئے۔

[1] مقالاتِ شبلی جلد پنجم مطبوعہ اعظم گڈھ صفحہ ۶۲

بایں ہمہ یہ حقیقت سورج کی طرح چمک رہی ہے کہ مقامِ عزیمتِ دعوت جو مقامِ خاص ہے وہ ان میں سے کسی کے حصے میں نہ آیا۔ وہ صرف شیخ الاسلام ابن تیمیہ ہی کے لیے تھا۔ سب دوسرے کاموں میں رہ گئے۔ لیکن انہوں نے وہ سب کام بھی ان سے بہتر کیے، جو وہ سب کر رہے تھے، اور پھر اُن سے بڑھ کر یہ کہ سب کو راہ عزیمت و دعوت، تجدید و احیائے ملت و رفعِ اعلامِ سنت و اخمارِ بدعت و کشفِ ابرازِ معارفِ مستورۂ کتاب و سنت و غوامض و سرائرِ معارفِ حکمتِ نبوت و انفجارِ ینابیع الحکمت من اللسانِ والجنانِ، جہاد فی سبیل اللہ بالسیف والقلم واللسان میں منزلوں اپنے پیچھے چھوڑ دیا۔ اور علوم و اعمال و ہبیہ و سماویہ کی ان بلندیوں پر تن تنہا جا کھڑے ہوئے، جہاں اُن کے احوال معاصرین کے وہم و تصور کو بھی بار نہیں۔ حتٰی کہ خود ان کے معاصرین کو بیک زبان و یک قلم ہو کر اعتراف کرنا پڑا۔ ”ما رَأَیْنَا مِثْلَهُ وَانه مَا رأی مثلہ“ نہ تو ہماری آنکھوں نے اُس کا مثل دیکھا اور نہ خود اس کو اپنا سا کوئی نظر آیا۔

اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم [1]

شیخ الاسلام کے بارے میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی نے ملا محمد معین سندھی حنفی مصنّف دراسات اللبیب کے سوالات کے جوابات میں لکھا اور شیخ الاسلام پر درج ذیل الفاظ میں تبصرہ فرمایا:

”ہم نے ان (ابن تیمیہ) کے حالات کی خوب تحقیق کی ہے۔ وہ قرآن مجید کے عالم، حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حافظ، دونوں کے لغوی و شرعی معانی کے ماہر، آثارِ سلف کے عارف اور نحو و لغت کے اُستاد تھے۔ حنبلی مذہب کے اصولاً و فروعاً تنقیح کنندہ محقق، ذہانت میں یکتا، اہلِ سنت کی طرف سے دفاع کرنے میں تیز طرار، اور فصیح و بلیغ (عمل میں) فسق اور (عقیدہ میں) بدعت کی ان میں کوئی بات

[1] تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ انارکلی کتاب گھر۔ لاہور صفحہ ۱۶۱

نہ تھی۔ چند ایک مسئلوں میں خواہ مخواہ اُن پر سختی کی گئی۔ حالانکہ ان میں کوئی مسئلہ ایسا نہیں، جس میں ان کے پاس قرآن و حدیث اور آثارِ سلف سے دلیل نہ ہو۔[1]

محی السنۃ والاجاہ نواب صدیق خان رئیس بھوپال نے اپنی کئی ایک تصانیف میں شیخ الاسلام کا تذکرہ لکھا ہے۔[2]

اور تقصار میں جو خراجِ تحسین پیش کیا۔

درسلوک شانے عظیم داشت، حکایات و کرامات و روایات و برکاتِ اُو بیش از حصرِ امت[3]

اور ایک دوسری جگہ حضرت والاجاہ یوں تعارف پیش کرتے ہیں۔

" مجدد مأۃ ہفتم شیخ الاسلام ابن تیمیہ و حافظ ابن القیم است و تجدید این دو بزرگوار کارے کرد کہ مثل آں از سلف و خلف معہود نیست، کتب دفاترِ اسلام و تواریخ و سیر از احوالِ ایشاں مشحون است[4]

برصغیر میں شیخ الاسلام کی تصانیف کا تعارف کرانے میں علمائے غزنویہ اہل حدیث (امرتسر) کا بڑا حصہ ہے، جیسا کہ مشہور عالم اور محقق مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف مدظلہ العالی مدیر الاعتصام فرماتے ہیں۔

" علمائے غزنویہ (امرتسر) کا امراء و علمائے نجد سے تعلق پیدا ہوگیا جس کے نتیجہ میں ہمارے ہاں معارفِ ابن تیمیہ کا مزید ورود ہوا۔ جب کہ نواب صاحب کا ذریعہ

---

[1] مکتوبات شاہ ولی اللہ دہلوی طبع احمد دہلی صفحہ ۲۷

[2] اتحاف النبلاء للنواب صدیق حسن خان القنوجی طبع ۱۲۸۸ھ / ۱۸۷۱ء

الجد العلوم للنواب صدیق حسن خان القنوجی طبع ۱۲۹۹ھ

التاج المکلل للنواب صدیق حسن خان القنوجی طبع ۱۲۹۹ھ

[3] تقصار للنواب صدیق حسن خان القنوجی طبع ص ۷۶

[4] حجج الکرامہ فی آثار القیامہ للنواب صدیق حسن خان القنوجی صفحہ ۱۳۶ - ۱۳۷

علمائے یمن مفتے۔ بزرگانِ غزنویہ مولانا محمدؒ صاحبِ حاشیۂ تفسیر جامع البیان مولانا عبدالجبار، مولانا عبدالرحیم، مولانا عبدالواحد رحمہ اللہ تعالیٰ کی توجہ سے شیخ الاسلام کی بعض تصانیف طبع ہوئیں اور تدریسی طریقے سے آپ کی دعوتِ توحید اور ذکر و فکر کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے ساتھ مصر سے شیخ الاسلام کی تصانیف اور تراجم پر مشتمل کئی کتابیں اور مختلف مجلات میں اہلِ علم کے مقالات آنے شروع ہو گئے۔ اب تعلیمات ابن تیمیہ پر سے صدیوں سے پڑے ہوئے پردے بڑی حد تک اُٹھ گئے۔ حقیقتِ حال سے تحقیق پسند علماء واقف ہوئے تو علوم ابن تیمیہ کی شیدائیت بڑھی۔ اُدھر فارسی کی جانشینی کا شرف اُردو کو حاصل ہوگیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے اُردو ادب کے دو صاحبِ علم مولانا شبلی نعمانی مرحوم اور مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو توفیق بخشی کہ انہوں نے اُردو دان طبقے کو شیخ الاسلام سے روشناس کرایا۔[1]

اب آپ شیخ الاسلام کے حالات اور اُن کے علمی و دینی کارنامے ملاحظہ فرمائیں۔

نام و نسب و ولادت | احمد نام، عرف ابن تیمیہ، کنیت ابوالعباس، لقب تقی الدین۔ سلسلۂ نسب یہ ہے:۔ احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام بن عبداللہ بن الخضر بن محمد بن الخضر بن علی بن عبداللہ۔[2] تیمیہ آپ کے دادا محمد بن خضر کی والدہ تھیں۔ یہ خاتون بہت بڑی عالمہ اور فاضلہ تھیں۔ اس لیے یہ سارا خاندان اُن کی طرف منسوب ہوگیا۔[3]

اس کی تائید حافظ ابن کثیرؒ نے بھی کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ "تیمیہ، امامِ موصوف کی دور کی ایک دادی کا نام ہے"۔[4]

---

[1] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ مصری (اُردو) مطبوعہ المکتبۃ السلفیہ لاہور صفحہ ۸

[2] الکواکب الدریہ۔ شیخ مرعی بن الکرمی الحنبلی صفحہ ۱۲۹
الرد الوافر حافظ ابوعبداللہ شمس الدین محمد بن ابی بکر بن ناصر الدین الشافعی صفحہ ۱۵۰

[3] طبقات الحنابلہ ابن رجب البغدادی۔

[4] اختصار علوم الحدیث از حافظ ابن کثیر الدمشقی الشافعی صفحہ ۸۶

آپ کی ولادت ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ بمقام حران ہوئی۔ اور اس پر آپ کے تمام سیرت نگار متفق ہیں[1]

نقلِ سکونت امام ابن تیمیہ جس دور میں پیدا ہوئے اُس وقت سارا عالمِ اسلام تاتاریوں کی ہیبت سے لرزہ براندام تھا۔ امام ابن تیمیہ نے اپنی زندگی کے ابتدائی ۶ سال حران میں ہی گزارے۔ جب امام نے ساتویں سال میں قدم رکھا تو حران بھی تاتاری حملہ کی زد میں آگیا۔ تاتاریوں کے حملہ کے بعد علم و فضل عزت و آبرو اور جان و مال کے لیے کوئی پناہ کی جگہ نہ تھی[2]

آخر مجبور ہو کر ان کا خاندان بھی شرفاء و علماء کے صدہا خاندانوں کی طرح کسی اسلامی ملک میں پناہ ڈھونڈھنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ الگ الگ سواری کا بندوبست نہ تھا۔ سب کے سب ایک گاڑی میں بیٹھے۔ کتابیں بھی اسی گاڑی میں رکھ لیں۔ تاتاری بھی تعاقب میں تھے۔ لیکن خدا نے بچا لیا اور گرتے پڑتے دمشق پہنچ گئے[3]

تعلیم و تربیت دمشق پہنچنے پر حضرت امام کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع ہوا مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ یہ قافلہ جس طرح دمشق پہنچا، حضرت امام نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا تھا اس لیے شروع سے ہی تاتاریوں کے خلاف نفرت آپ کے دل میں نقش ہوگئی۔ اُستاد ابوزہرہ لکھتے ہیں۔

”خدا کی مدد کے ساتھ یہ قافلہ سلامتی کے ساتھ دمشق پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ خوف و دہشت کے ان لرزہ خیز حوادث کی داستانیں جس کے کانوں میں برابر پڑتی رہی تھیں اور ان زہرگداز حالات کا جس کی آنکھیں مشاہدہ کرتی رہی

1 حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۵۱
امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن مطبوعہ مدراس صفحہ ۵۵
تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم ص ۳۸
مقالات شبلی جلد پنجم صفحہ ۶۴ امام ابن تیمیہ از برق ص ۶۳
2 تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۳۸
3 مقالات شبلی جلد پنجم صفحہ ۶۴

تھیں۔ وہ یہی حساس اور نو عمر لڑکا احمد تقی الدین تھا۔ اس نے تاتاریوں کے غارت گری کے واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اس نے امن و سکون کی زندگی بسر کرنے والوں کو خوف و دہشت سے نیم جان دیکھا تھا، جو جائے پناہ تلاش کرنے کے لیے اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے تھے۔ اس نونہال نے اپنے خاندان کی زبوں حالی بھی دیکھی تھی۔ راہ کی دشواریاں، گراں بہا کتب کی بربادی، مال و اسباب کے ضائع ہو جانے کا خوف، اس حساس اور سمجھدار لڑکے نے اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی میں تاتاریوں سے نفرت کا نقش دل پر بیٹھ گیا۔[۱]

ابتدائی تعلیم آپ کی حران ہی میں شروع ہوئی۔ دمشق آنے کے بعد باقاعدہ تعلیم کے دور کا آغاز ہوا۔ آپ کی تعلیم کی ابتداء دار الحدیث السکریہ میں شروع ہوئی جہاں آپ کے والد عبد الحلیم ابن تیمیہ شیخ الحدیث تھے۔ دار الحدیث السکریہ کے علاوہ مدرسہ الحنبلیہ میں بھی آپ نے تعلیم حاصل کی۔[۲]

غیر معمولی حافظہ آپ ایک زبردست قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ ان کے دادا اور والد بھی غیر معمولی حافظہ کے مالک تھے۔ لیکن تقی الدین ابن تیمیہ اپنے پورے خاندان سے سبقت لے گئے۔ اور بچپن ہی میں اُن کے عجیب و غریب حافظہ اور سرعتِ حفظ نے علماء اور اساتذہ کو متحیر کر دیا۔ قرآن مجید تو آپ نے بچپن ہی میں حفظ کر لیا تھا۔ امام صاحب کے شوقِ تلاوت کا یہ عالم تھا کہ اپنی زندگی کے دَور میں کبھی بھی تلاوت سے ناغہ نہیں کیا۔ چنانچہ جیل میں آپ نے اسّی سے زیادہ بار قرآن مجید کو از اوّل تا آخر پڑھا۔[۳] آپ کے حافظہ کی شہرت دمشق میں پھیل گئی۔ صاحب العقود الدریہ فی مناقب ابن تیمیہؒ امام صاحب کی صفت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

---

[۱] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۵۲

[۲] امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۵۶

[۳] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۵۵ — بحوالہ البدایۃ والنہایۃ ابن کثیر جلد ۱۴ ص ۱۳۵ شذرات ذہبی جلد ۶ ص ۸۶

"حلب کے ایک مشہور عالم دمشق وارد ہوئے۔ انہوں نے فرمایا میں نے سنا کہ یہاں ایک لڑکا ابن تیمیہ ہے جو غیر معمولی قوتِ حافظہ کا مالک ہے۔ یہاں میں اس کے لیے آیا ہوں کہ ذرا اسے دیکھ لوں۔ ایک درزی نے کہا، جی ہاں وہ لڑکا ابھی ادھر سے گزرے گا۔ ذرا دیر تشریف رکھیے، بس وہ یہاں آیا ہی چاہتا ہے۔ یہ سن کر وہ شیخ جلیل بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک لڑکا پاس سے گزرا۔ درزی نے شیخ حلبی سے کہا۔ یہ لڑکا جو ایک بڑی سی تختی لیے جا رہا ہے یہی احمد بن ابن تیمیہ ہے۔ شیخ حلبی نے آواز دی۔ وہ آواز سن کر قریب آگیا۔ شیخ نے تختی لے کر ایک نظر اس پہ ڈالی۔ پھر کہا بیٹے اس تختی پہ جو کچھ لکھا ہے اسے مٹا ڈالو۔ میں جو کچھ بولوں گا وہ لکھتے جاؤ۔ لڑکے نے ایسا ہی کیا۔ شیخ حلبی نے کم و بیش تیرہ حدیثیں لکھائیں۔ پھر پوچھا "کیا لکھا ہے؟" لڑکے نے لکھنے کے بعد ایک اچٹتی سی نظر اپنے لکھے ہوئے پر ڈالی اور تختی شیخ کی طرف بڑھا دی۔ شیخ نے تختی لے کر کہا، اب ذرا سناؤ تو کیا لکھا ہے۔ لڑکے نے فر فر وہ ساری عبارت سنا دی۔ شیخ نے دوبارہ کہا، اچھا جو کچھ لکھا تھا وہ اب مٹا ڈالو۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی۔ پھر شیخ نے اپنے منتخب کیے ہوئے چند اسانید کا املا کرایا۔ پھر کہا، پڑھو، کیا لکھا ہے تم نے؟ پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی لڑکے نے اپنے لکھے ہوئے پر ایک نظر ڈالی اور تختی شیخ کے حوالے کر دی۔ اور پھر سارا فر فر سنا دیا۔ شیخ حلبی یہ کمال دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا، یہ لڑکا اگر زندہ رہ گیا تو بڑا مرتبہ حاصل کرے گا۔ میری نظر سے آج تک کوئی ایسا لڑکا نہیں گزرا[1]

تکمیل تعلیم دار الحدیث السکریہ اور مدرسہ الحنبلیہ کے فاضل اساتذہ سے تعلیم حاصل کر کے دیگر علمی مراکز میں پہنچے اور مختلف اساتذہ سے صرف، نحو، منطق، معقول و منقول، فقہ، اصول فقہ، ادب تاریخ، لغت، حدیث اور تفسیر پڑھی[2]

---

[1] حیات ابن تیمیہ۔ ابوزہرہ صفحہ ۵۶ بحوالہ العقود الدریہ ابن الہادی صفحہ ۲۱

[2] امام ابن تیمیہ از برق صفحہ ۲۴

تفسیر ابن تیمیہ کا محبوب موضوع تھا اور ان کو اس سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کا خود بیان ہے کہ انہوں نے تفسیر قرآن میں چھوٹی بڑی ۱۰۰ سے زائد کتابوں کا مطالعہ کیا۔ اس فن سے ان کو فطری مناسبت تھی۔ قرآن مجید کی تلاوت، تدبر اور مطالعہ کی کثرت سے اللہ تعالیٰ نے ان پر علومِ قرآن کا خاص افاضہ فرمایا تھا۔ کتابوں کے علاوہ خود صاحبِ کتاب کی طرف رجوع کرتے تھے۔ اور اس سے فہمِ قرآن اور شرحِ صدر کی دولت مانگتے تھے۔ اپنی طالب علمی اور اپنے تدبر فی القرآن کے طریقے کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں کہ:۔

بعض اوقات ایک ایک آیت کے بیے میں نے سو سو تفسیروں کا مطالعہ کیا ہے۔ مطالعہ کے بعد اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا کہ مجھے اس آیت کا فہم عنایت ہو۔ میں عرض کرتا کہ "اے آدم و ابراہیم کے معلّم! میری تعلیم فرما" میں سنسان اور غیر آباد مسجدوں اور مقامات کی طرف چلا جاتا اور اپنی پیشانی پر خاک ملتا۔ اور کہتا کہ "اے ابراہیم کو تعلیم دینے والے مجھے سمجھ عطا فرما"[1]

تفسیر قرآن کے ساتھ ساتھ امام ابن تیمیہ کو فنِ حدیث سے بہت زیادہ شغف تھا۔ اس زمانہ کے مختلف علوم متداولہ کے ساتھ وہ بکثرت شیوخ حدیث کی خدمت میں حاضر ہو کر حدیث کی مختلف کتابیں بحث و تکرار کے ساتھ پڑھتے رہے[2]۔ حدیث میں سب سے پہلی کتاب جو امام صاحب نے حفظ کی وہ امام حمیدی کی کتاب الجمع بین الصحیحین ہے[3]۔

امام صاحب کے شیوخ حدیث کی تعداد دو سو سے متجاوز ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن عبد الہادی نے اس کی تصریح کی ہے[4]۔ ان میں سے متعدد خاص خاص نام انہوں نے گنائے ہیں۔

(نوٹ از ادارہ:۔ ۴۴۔ اسماء کی اس فہرست کو ہم نے درج نہیں کیا)۔

---

[1] تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۴۲ بحوالہ العقود الدریہ صفحہ ۲۶
[2] امام ابن تیمیہ از محمد یوسف کوکن صفحہ ۵۸
[3] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۵۷
[4] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۵۸۔ امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۵۸۔ مقالاتِ شبلی صفحہ ۵۸

دیگر اساتذہ محولہ بالا شیوخ کے علاوہ امام ابن تیمیہ نے بہت سے شیوخِ حدیث سے استفادہ کیا۔ انہوں نے مسند امام احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد سجستانی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارقطنی کی بار بار سماعت کی[1] جس کی وجہ سے انہوں نے حدیث پر کامل عبور حاصل کر لیا۔ یہاں تک کہ کہا جانے لگا کہ "جس حدیث کو امام ابن تیمیہ نہیں جانتے وہ حدیث ہی نہیں ہے"[2]

دوسرے علومِ عصری میں کمال حدیث کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم و فنون، مثلاً فقہ، اصولِ فقہ، ادب، تاریخ، لغت، منطق، فلسفہ اور ریاضی وغیرہ میں خاصی دسترس حاصل کی اور ان علوم میں اس آخری حد تک کمال حاصل کیا، گویا یہی اُن کا منشا اور مقصد تھا۔ عربی کا بہت کلامِ نثر و نظم ازبر کیا۔ فنِ نحو میں کمال حاصل کیا۔ کتاب سیبویہ پر عبور کا یہ عالم تھا کہ اُس کا درس دیتے تھے۔ اور ساتھ ساتھ نقد کا سلسلہ بھی جاری رکھتے۔ چنانچہ کتاب کے کئی ایک مسائل ایسے تھے جن سے اختلاف تھا۔ اور اس کا برملا اظہار کرتے تھے[3]

غرض ابن تیمیہ نے اپنے زمانے میں کتاب و سنت کی ترجمانی اور دین کی صداقت و برتری ثابت کرنے اور علمی و عملی گمراہیوں کو دُور کرنے کے لیے ایسی وسیع اور مکمل علمی تیاری کی۔ جس کی اُس ترقی یافتہ علمی دَور اور فکری و دینی انتشار کے زمانے میں ضرورت تھی۔ اُنہوں نے ان تمام اسلحہ کا استعمال سیکھا جن سے ان کے حریف اور مخالفین اسلام (یہود و نصاریٰ فلاسفہ اور باطنیہ) مسلح تھے۔ اُنہوں نے وہ علمی تبحر پیدا کیا کہ اُن کے معاصرین دیکھ کر دنگ رہ گئے[4]

ان کے مشہور حریف علامہ کمال الدین الزملکانی ان کی علمی جامعیت اور ہمہ دانی کا اعتراف

---

[1] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۵۷
[2] امام ابن تیمیہ محمد یوسف کوکن صفحہ ۴۷
[3] حیات ابن تیمیہ ابوزہرہ صفحہ ۵۸
[4] تاریخ دعوت و عزیمت جلد دوم صفحہ ۴۴

ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

ابن تیمیہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے علوم اس طرح نرم کر دیے تھے، جس طرح داؤد علیہ السلام کے لیے لوہا نرم کر دیا تھا۔ جس علم کے بارے میں ان سے سوال کیا جاتا، اس طرح جواب دیتے کہ دیکھنے والا یا سننے والا یہ سمجھتا کہ وہ اس فن کے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ فیصلہ کرتا کہ ان کی طرح کوئی اس فن کا عالم نہیں۔ ہر مذہب فقہ کے علماء جب ان کی مجلس میں شریک ہوتے تو ان کو کوئی نہ کوئی ایسی چیز معلوم ہوتی جو ان کو پہلے سے معلوم نہ تھی۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی سے مناظرہ کیا ہو اور بند ہو گئے ہوں۔ جب کبھی انہوں نے کسی شرعی یا عقلی علم میں کلام کیا تو ماہرین فن سے اور اس کے مخصوص عالموں سے بڑھ گئے۔ تصنیف میں بھی ان کو ید طولیٰ حاصل تھا۔[1]

(باقی)

---

[1] تاریخ دعوت وعزیمت جلد دوم صفحہ ۴۴ بحوالہ الکواکب الدریہ صفحہ ۱۵۔

رسائل ومسائل

اسلام اور جمہوریت پر سوالات

"میرے سامنے" اسلام اور جمہوریت" کی بحث کے سلسلے میں ایک سوالنامہ ہے۔ یہ سوالنامہ دراصل ایک روزنامے کی طرف سے بھجوایا گیا تھا۔ مگر بعد میں اس کے تحریر شدہ جواب مجھ سے وعدہ کے مطابق وصول نہیں کیے۔ اب مجھے خیال ہوا کہ اس بحث کو رسائل ومسائل ہی میں پیش کر دوں۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے جوابوں کی صرف تمہیدی گفتگو دی جاسکی ہے، انشاءاللہ آئندہ سوالات اور جوابات اکٹھے درج کیے جائیں گے۔

(ن ۔ ص)

میں آپ کے سوالوں کے جواب عرض کرنے سے پہلے آپ کی توجہ اس امر کی طرف دلانا چاہتا ہوں کہ یہ بحث بہت پرانی ہے کہ اسلام اور جمہوریت میں کوئی ربط ہے اور ہو سکتا ہے یا نہیں، اور ہو سکتا ہے تو کس صورت میں۔ اور اس بحث کا عملی طور پر بھی اور سیاسی دستوری طور پر بھی ایک بار فیصلہ ہو چکا ہے۔ لیکن آپ کے سوالات کا انداز ایسا ہے، گویا ان دنوں بالکل نئی بحث پیدا ہوگئی ہے اور کم سے کم آپ کی معلومات کے دائرے میں اس بحث کی پچھلی تاریخ نہیں ہے اور نہ آپ کو یہ علم ہے کہ نزاع کسی فیصلے پر پہنچ کر ختم ہو گئی تھی۔ آپ ایک باصلاحیت صحافی ہیں اور میرے عزیز دوست، مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ کا مستفسرانہ انداز یہ غمازی کرتا ہے کہ آپ کسی دور دراز علاقے سے نصف صدی بعد یکایک اس سرزمین میں وارد ہوتے ہیں اور چالیس پچاس سال کے فکری ارتقا کو بالکل نہ جانتے ہوئے بات کر رہے ہیں۔

بحث حسب ذیل نقطہ ہائے نظر میں تقریباً پچھلی پون صدی میں چلتی رہی ہے :۔

ا۔ اسلام میں جمہوریت ہے اور وہ مغربی جمہوریت سے اعلیٰ تر ہے۔

ب۔ یہی جمہوریت جو مغرب میں چل رہی ہے، عین اسلام کے تقاضوں کے مطابق ہے، لہٰذا اسے لے کے چلنا چاہیے۔

ج۔ اسلام میں جمہوریت نہیں ہے بلکہ وہ صرف اطاعتِ امیر چاہتا ہے۔

د۔ اسلام میں جمہوریت کے بجائے شورائیت کا سسٹم ہے۔ آگے اس کے متعلق تین رویے چلتی رہی ہیں: ایک یہ کہ امیر یا خلیفہ شوریٰ سے صرف مشورہ لینے کا پابند ہے۔ شوریٰ کی سو فیصد اکثریت کا متفقہ نقطۂ نظر بھی اُسے اِس سے باز نہیں رکھ سکتا کہ وہ پورے عزم کے ساتھ اپنے پسندیدہ نقطۂ نظر کو نافذ کرے۔ دوسری یہ کہ بالعموم تو وہ اپنی مجلسِ شوریٰ کے متفقہ یا اکثریتی فیصلوں کا ساتھ دے گا مگر اسے ویٹو کا اختیار حاصل ہے جسے وہ حسبِ ضرورت استعمال کر کے اپنی مرضی سے مجلسِ شوریٰ کے خلاف فیصلہ کر سکتا ہے۔ تیسری رائے یہ بھی سامنے آتی رہی کہ امیر کو لازماً مجلس شوریٰ کے متفقہ یا اکثریتی فیصلوں پر عمل کرنا چاہیے۔

عملاً مولانا حسین احمد مدنی اور بعض دوسرے دینی اکابر کانگریس کے ساتھ، اور مولانا شبیر احمد عثمانی مغفور اور دیگر علماء مسلم لیگ کے ساتھ کام کرتے رہے، اور یہ دونوں جماعتیں جمہوری ڈھانچے پہ کام کرتی تھیں۔ اتنا ہی نہیں، تمام کارپوریشنیں، میونسپل کمیٹیاں، نوٹیفائڈ ایریاز کے کارپرداز ادارے، ڈسٹرکٹ کونسلیں، اوقاف اور رجسٹرڈ اداروں کے بورڈ آف ڈائریکٹرز، یونیورسٹیوں اور اعلیٰ مدارس کے چلانے والی ہیئتیں، تجارتی کمپنیوں اور فرموں کے منتظمین، دیہات کی پنچائتیں، محلہ کمیٹیاں، غرضیکہ تمام شعبے کسی نہ کسی طرح کے جمہوری نقشے پہ چلتے رہے اور ان میں سے بیشتر کے لیے انتخابات بھی ہوتے رہے، کونسلوں کی نشستوں کے لیے ووٹ بھی دیتے جاتے رہے۔ اور ان کاموں سے اصحاب دین و تقویٰ بھی بالکل الگ نہیں رہے، بلکہ تحریک پاکستان کے زیر اثر ۱۹۴۵ء کے الیکشن میں تو بھاری حصہ علماء اور مشائخ کا شامل تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ——— ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء کے انتخابات تک علماء اور اُن کی دینی جماعتوں اور مدرسوں نے جمہوری خطوط پہ کام کرنے والی سیاست میں دل کھول کر حصہ لیا۔ بلکہ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں حکومتی پارٹی کی رخنہ اندازی کا ردِ عمل جس طوفانی

تحریک کی شکل میں سامنے آیا اُس کا ہر اول دستہ علما تھے۔ اور اُن پر اعتماد کرنے والی دینی جماعتوں کا اتحاد!

اُدھر علمی دائرے میں ایک کام کرنے والے نے یہ کام کیا کہ ایک طرف یہ ثابت کیا کہ اسلام کے اُصولِ سیاست و حکمرانی آج کے دَور میں بھی بخوبی چل سکتے ہیں۔ دوسری طرف یہ حقیقت نمایاں کی کہ خدا کی حاکمیت پر مبنی اور قانونِ شریعت کی پابندی میں کام کرنے والے اسلامی نظام کے اندر خود اپنے طرز کی اتنی اور ایسی جمہوریت موجود ہے کہ بادشاہت، آمریت اور استبدادی نظاموں سے ڈرے ہوئے لوگ اطمینان کے ساتھ اُسے اپنا سکتے ہیں۔ اس مردِ حق کی بات واعظانہ طرز کی سرسری بات نہ تھی بلکہ اُس نے اسلام کا ایک مکمل سیاسی نظریہ کتاب و سنت سے اخذ کر کے ایسی زبان میں پیش کر دیا کہ جسے اِس زمانے کے دانشور اور نوجوان آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ اور اس سے متاثر ہو سکتے تھے۔ اِدھر دینی حلقوں کی بھی خاصی تعداد مطمئن ہو گئی کہ اُن کے سامنے جو مبہم تصور تھا، اسے پرانی مذہبی سیاسی زبان اور اصطلاحات کے چکر سے نکال کر ایک شخص نے ایسی ترجمانی کر دی ہے جس سے بحث کے تمام ضروری اجزا روشن اور واضح ہو گئے ہیں۔ یہ شخص کون تھا؟ ــــ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ۔

مودودی صاحب کا پیش کردہ ایک گراں بہا نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں جمہوری حاکمیت نہیں ــــ بلکہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے تحت "جمہوری خلافت" (POPULAR VICEGERENCY) ہے۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ کسی مذہبی طبقے کی پاپائی حکومت (THEOCRACY) نہیں، بلکہ خدا پرستانہ جمہوریت (THEO - DEMOCRACY) ہے۔ انہی دو اصولی حقیقتوں نے مغربی جمہوریت کو مسترد کر دیا۔ باقی صرف سیاسی مشینری رہ جاتی ہے جس میں آپ اگر اسلام کے اصولوں کو کارفرما کر دیں۔ اور ان اصولوں کی ضرورت کے مطابق خود مشینری میں بھی رد و بدل کر لیں تو ایک نئے طرز کی جمہوریت رونما ہو جائے گی۔

جہاں تک فی نفسہٖ اجتماعی معاملات میں تصورِ جمہوریت کا تعلق ہے، یہ ہمارے ہاں اوّل روز سے ہے۔ خود جمہور کی اصطلاح تفسیر، فقہ اور دوسرے علوم میں رائج ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ جمہور علما یا جمہور مفسرین یا جمہور فقہا کا نقطۂ نظر یہ ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ دو ایک آدمی کوئی دعویٰ کر رہے ہیں، بلکہ اس کا واضح مطلب یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ کسی قلیل تعداد کے استثنیٰ

کے سامنے بہت بڑی اکثریت کسی بات پر متفق یا ہم خیال ہے۔ اور یہ بات بجائے خود بڑا وزن رکھتی ہے کہ کسی قول یا امر کے حق میں یا خلاف فلاں خاص رائے جمہور علما، یا ماہرین کی ہے۔ زیادہ تعداد کے ہم خیال یا مجتمع ہونے کا ہمیشہ ایک وزن رہا ہے۔ بشرطیکہ وہ تعداد احمقوں اور مجرموں پر مشتمل نہ ہو اور جس امر پر اتفاق کیا گیا ہو، وہ واضح طور پر باطل یا ظلم یا گناہ نہ ہو۔ اسی طرح ہماری اپنی ہی ایک اصطلاح "اجماع" ہے۔ اجماع تام یہ ہے کہ کسی مجلس یا ادارے یا دائرہ علم کے تمام لوگ ایک نقطہ نظر پر متفق ہو جائیں۔ اور اجماعِ ناقص یہ ہوگا کہ اُن لوگوں کی اکثریت متفق ہو جائے۔ لیکن ہمارا لٹریچر گواہی دے گا کہ "اجماع" کو ہر دائرے میں اہمیت حاصل ہے۔

اس جملہ معترضہ کو ایک طرف چھوڑ کر ہم پھر اوپر کے سلسلہ گفتگو کو برقرار رکھتے ہیں۔ مولانا مودودی مغفور اگر محض واعظ ہوتے تو اسلامی جمہوریت و شورائیت پر تقریریں کرتے ہوئے خوب فصاحت کے دریا بہا دیتے مگر پلے کچھ نہ پڑنے دیتے۔ اگر مفتی ہوتے تو اُن کا فریضہ اتنا ہی ہوتا کہ وہ کتاب و سنت میں مندرج احکام اور اُن سے متعلق آثار اور فقہاء کے اقوال کی روشنی میں اپنا فتویٰ دے دیتے۔ یہ اُن کا دردِ سر نہ ہوتا کہ موجودہ احوال و ظروف میں اس فتوے پر کس طرح عمل ہوگا۔ اور اسلام کی ہیئت سیاسیہ کن بنیادوں پر کس طرح استوار ہوگی، یا اس کام میں کیا خطرات ہو سکتے ہیں اور اُن کا توڑ کیا ہے۔ ایسے سوالوں سے مفتی بالا تر ہوتا ہے۔

مولانا مودودی مغفور کو بہت بڑی فکری لڑائی لڑ کر یہ ثابت کرنا پڑا کہ اسلامی بنیادوں پر اگر جمہوری مشینری کو از سرِ نو تشکیل دیا جائے تو یہ خلافِ اسلام نہیں ہے۔ انہیں یہ اطمینان دلانا پڑا کہ اس میں تھیاکریسی کے تسلط کا خطرہ نہیں ہے، نیز انہیں جدید طبقوں کے اس اندیشہ کا توڑ مہیا کرنا پڑا کہ اسلامی ہیئتِ سیاسیہ میں آمریت کا ظہور نہایت آسانی سے ہو سکتا ہے جب کہ اس کا ازالہ آسانی سے نہیں ہو سکتا۔

یہ بحثیں عرصہ تک چلیں، یہاں تک کہ اسلام سے وابستگی رکھنے والے اکثر ذہن "اسلام کے نظریہ سیاسی" کے یا تو خود داعی بن گئے، یا قائل یا حامی۔

کیسے ہوتے مؤثر کام ہی کی یہ برکت ہے کہ تشکیل پاکستان کے بعد جب یہ اندازہ ہوا کہ مغرب پرست سیکولر طبقے کے سیاست کار اور بیورو کریٹس یہاں ایک غیر دینی دستور مسلط کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

نومبر ۴۸ء میں مولانائے مغفور کے پیش کردہ چار نکاتی مطالبہ (بعد میں مزید نکات کا اضافہ بھی ہوا) کو نہایت تیزی سے دینی حلقوں کی تائید بھی حاصل ہوئی اور مسلم مزاج کے جدید تعلیم یافتہ اصحاب اور اُن کے اداروں نے بھی حمایت میں زور صرف کیا۔ یہاں تک کہ اسلامی دستور کے لیے پُرزور تحریک جاری ہوگئی اور اس تحریک کے فتوحات میں پہلی چیز "قرارداد مقاصد" تھی جو مارچ ۱۹۴۹ء میں پاس ہوئی۔

اِس تاریخی دستاویز کا بغور جائزہ لے کر ملاحظہ کیجیے یہ جس طرزِ فکر پر مبنی ہے وہ ٹھیک وہی ہے، جس کے لیے یہاں چند برس پہلے سے کام کیا جا رہا تھا اور اس کی دفعات کا "مطالبۂ دستورِ اسلامی" کے نکات سے ربط صاف دکھائی دے رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قرارداد کا ڈھانچہ اسلامی بنانے کے ساتھ ساتھ دستوری خاکوں کا مزاج دوسرا اختیار کیا گیا۔ قرارداد کو گویا محض بطور لیبل استعمال کرنا مطلوب تھا۔ دستوریہ کی بنیادی اصول کی کمیٹی کی پہلی رپورٹ قوم کے دباؤ کی وجہ سے مسترد ہوگئی اسی دوران میں سیکولر طبقے نے یہ چیلنج اُٹھایا کہ مختلف گروہوں کے علماء مل کر کوئی متفقہ دستوری نقشہ ہمیں بنا کر دیں تو پھر اس کے مطابق اسلامی دستور بنایا جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ چیلنج پیش کرنے والوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ یہ تو سرے سے امکان ہی نہیں کہ علماء کوئی متفقہ دستوری نقشہ دے سکیں۔ بلکہ لامتناہی بحثیں اور جھگڑے چل پڑیں گے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ تمام نمایاں مدارسِ فکر کے نہایت سرکردہ ۳۱ علماء و مشائخ ہر حصۂ ملک سے کراچی میں جمع ہوئے اور انہوں نے غور و بحث کے بعد اسلامی دستور کے لیے ۲۲ اُصولوں کا ایک خاکہ جنوری ۵۱ء میں پیش کر دیا۔ علماء کا یہ اجماع اپنی نوعیت کے لحاظ سے سیاسی و جمہوری دائرے سے متعلق تھا۔ اور اسلامی ریاست کے عملاً معطل ہو جانے کے بعد سے اس دائرہ میں علمی و فکری کام بھی کم ہوا ہے، نیز نئے احوال و ظروف کو سامنے رکھ کر نفاذِ احکام کے راستے نکالنے کا مسئلہ تھا۔ یہ علماء کا بڑا عظیم کارنامہ تھا کہ انہوں نے اجتماعیات میں دَورِ جدید کے پیدا کردہ اداروں اور احوال کو ملحوظ رکھ کر اور اُن سے اثر پذیر ذہنوں کی مشکلات کا اندازہ کر کے صحیح ترین نسخہ مرتب کیا۔ سیکولر طبقوں کے چیلنج کا جواب جس عالی ظرفی اور وسعتِ نظر سے دیا گیا ہے۔ لوگ خادمانِ دین سے اس کی توقع کم ہی کیا کرتے ہیں۔ پھر یہ اجماعی فیصلہ گویا تجدید و احیائے دین کی تاریخ کا ایک سنگِ میل تھا۔

واضح رہے کہ آج جو مولوی صاحبان جمہوریت و شورائیت کے موضوع پر عجیب عجیب فتوے دے رہے ہیں، اِن کے مقابلے میں وہ بہت بڑے علماء و مشائخ تھے اور ان کا اجتماع زیادہ نمائندہ اور سنجیدہ اجتماع تھا۔ اور اس اجتماع میں یہ نقطۂ نظر موجود ہی نہ تھا کہ ایوانِ حکومت کے رجحانات کی تائید کرنی ہے۔ اُن علماء نے اسلامی اصولوں کے تحت جمہوری ڈھانچے کو قبول کیا، نمائندہ ایوانوں کو قبول کیا، صدارت اور وزارت کے مناصب کو قبول کیا، اور اتنی بات کو قبول کیا۔ کیا وہ حضرات ایمان اور علم اور تقویٰ میں کسی سے کم تر تھے؟ اُن کے اجماعی فیصلے کو بدلنے کے لیے رسائل کے اداریے اور منبر کے خطبات کافی نہیں ہیں۔ ویسا نمائندہ اجتماع بلوایئے اور اسی طرح کی فضا میں سنجیدگی سے متفقہ فیصلے کیجیے، اپنی بات دوسروں سے منوایئے یا دوسروں کی بات مانیئے مگر اس کی ضرورت نہیں۔

علماء کے اس کام کا نتیجہ یہ تھا کہ دوسری دستوری رپورٹ کو ملک نے ناپسند کیا۔ پھر انہی علماء نے دوبارہ جمع ہو کر اس رپورٹ میں تفصیلی ترامیم کیں اور بیچ میں سے اگر ہم غلام محمد کی مخالفِ دستور کارروائیوں کا باب حذف کر دیں تو یہی ترمیم شدہ رپورٹ تھی، جس پر ۱۹۵۶ء کا دستور مبنی تھا اور جسے ساری قوم میں زیادہ سے زیادہ قبولیت حاصل ہوئی۔ مگر دستور ۱۹۵۶ء کے خطرے کا سدِباب کرنے کے لیے ۱۹۵۸ء میں مارشل لا سامنے آ گیا۔ پچھلا سارا کھیل ختم ہوا۔

اب ذرا غور کیجیے کہ ایک لمبے زمانی تسلسل میں بھاری محنتوں سے اسلام کی ہیئت سیاسیہ کا تصور نمایاں کرنے کے لیے جو کام کیا گیا اور جس سے بڑے بڑے نتائج پیدا ہوتے۔ اب چند مولوی صاحبان کے فتوؤں اور وعظوں کے تحت کیوں اس سارے کیے کرائے کو ختم کر دیا جائے اور نئے سرے سے اسلامی سیاست کے اصول طے کیے جائیں۔ یہ حضرات قوم کو یہ اُصول بتاتے ہیں کہ اسلام کا تقاضا بس یہ ہے کہ ایک امیر ہونا چاہیے۔ اور ایک شوریٰ ہونی چاہیے جس کے مشوروں کو امیر چاہے تو قبول کرے، چاہے تو اپنا فیصلہ نافذ کرے۔ لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ امیر کہاں سے نمودار ہو گا؟ اس کے آنے کا دروازہ کونسا ہو گا؟ شوریٰ کے ارکان کس طرح تلاش کیے جائیں گے؟ اور اگر امیر آمریت یا ملوکیت کی راہ پر چل پڑے تو چارۂ کار کیا ہو گا؟ اور امیر اور شوریٰ کے علاوہ جو ۶، ۷ کروڑ بالغ شہری ملک میں موجود ہوں گے، کیا انہیں سیاسی اُمور سے لاتعلق رکھا جائے گا؟ —— تو یہ حضرات ان سوالوں کے جواب فراہم نہیں کرتے بلکہ

کہتے ہیں کہ بس جی ہمیں تو غرض اسلامی نظام سے ہے، ہم اسے پورا پورا چلادیں گے، آگے جو ہو سو ہو، ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔

برادرم! آپ سوچیں، کیا ایسی باتوں سے دُنیائے سیاست میں کام چل سکتا ہے، اپنی قوم کو سمجھانا ہے، مذہبی لوگوں کے علاوہ بے مذہبوں کو بھی سمجھانا ہے، غیر مسلم اقلیتوں کو بھی مطمئن کرنا ہے، باہر کی اقوام کے سامنے بھی ثابت کرنا ہے کہ تمہارے عقلی اور افادی پیمانوں کے لحاظ سے بھی اسلام کے اصولِ سیاست و حکومت بہتر و برتر ہی نہیں، موجودہ دور میں پوری طرح قابلِ عمل ہیں۔

ایک بڑے انسانی مسئلے کا جو حل بحث و تمحیص کے بعد چند برس سے یہاں راسخ ہو رہا تھا — اور جس کے خلاف پہلے کبھی بڑے سے بڑے علماء کی طرف سے بھی اُس طرح کی کوئی نکتہ آفرینی نہیں ہوئی جیسی اب ہو رہی ہے — اُسے چند اصحاب مٹا کر ساری بحث نئے سرے سے چھیڑنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا حل پیش کرنا چاہتے ہیں۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ دوسروں کے سامنے اسلام کا کوئی نظریہ اور ڈھانچہ پیش کر کے لوگوں کو مطمئن کرنا۔ اور اُس سے متعلق پیدا ہونے والے سوالات کا وقیع حل فراہم کرنا دل و دماغ کی بڑی اُونچی صلاحیتیں چاہتا ہے۔

اب آپ سے میری گذارش یہی ہے کہ جس فراخ دلی سے آپ نے اپنے ہاں اس طے شدہ بحث کا کھاتہ از سرِ نو کھول دیا ہے۔ اس سے سوائے فکری انتشار کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن خیر کا پہلو اس میں یہ بھی ہے کہ جو لوگ اسلام کے منصوص اصول و مقاصد کو بھی جانتے ہیں۔ نئے دور کے مسائل اور اشکالات اور نو تشکیل یافتہ ادارات کی خوبیوں اور خرابیوں کا بھی شعور رکھتے ہیں۔ اس بحث کے ذریعے وہ اپنے موقف کو اور زیادہ قابل قبول بنا سکتے ہیں۔

مَیں کوشش کروں گا کہ اشاعتِ آئندہ میں آپ کے سوالات کے مختصر جواب عرض کر دُوں۔

مطبوعات

اسلامی لٹریچر کے فارسی تراجم

مولانا خلیل حامدی کے زیر اہتمام "دار العروبہ" سے الامام سید مودودیؒ کی چند چھوٹی کتابوں کے تراجم حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ ہیں: ۱۔ مبادی اسلام (رسالۂ دینیات) ۲۔ اسلام و ناسیونالیزم (مسئلۂ قومیت) ۳۔ روشِ زندگی در اسلام (اسلامی نظامِ حیات) ۴۔ تئوریٔ اخلاقیٔ اسلام (اسلام کا اخلاقی نظام)۔ ان کے ساتھ سید قطب شہید کی کتب کے تراجم یہ ہیں:۔ ۱۔ اسلام راہِ فطرتِ بشر (دینِ حق) ۲۔ دعوت نمائی درخشانِ اسلام (عالمِ اسلام کی تعمیر میں مسلم طلبہ کا حصہ)۔ ان میں سے بعض کے تراجم چند سال بیشتر بھی ہوئے تھے، مگر نئے تراجم میں بہتر زبان اختیار کی گئی ہے۔

مولانا مودودی مغفور کی کتابوں کے جو فارسی تراجم عربی تراجم سے کیے گئے تھے، اب از سرِ نو اردو متن کو سامنے رکھ کر ان کو اصلاح و ترمیم کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

ترجمہ کرنے والے جناب کلیم اللہ متین اور عبید اللہ اسد ہیں۔ یہ چھ کتب سفید کاغذ پر ٹائپ میں چھپی ہیں اور بہت ہی رنگین ٹائٹلوں کے ساتھ پیش کی گئی ہیں۔ بعض صورتوں میں تو ڈیزائنوں کا انداز بچوں کے مزاج سے ہم آہنگ ہے۔

اس وقت بڑی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس لٹریچر کو افغانستانی مہاجرین میں پھیلایا جائے اور ہو سکے تو اندرونِ افغانستان مجاہدین اور عام آبادی تک بھی پہنچایا جائے۔ جب تک نقطۂ نظر کی ہم آہنگی اور فکری استحکام پیدا نہ ہو، اندیشہ ہوتا ہے کہ بڑے بڑے انقلاب اپنے مقاصد حاصل نہیں کر پاتے۔

میری رائے تو یہ بھی ہے کہ اس لٹریچر کو، جہاں تک ممکن ہو، ایران میں بھی خواص و عوام تک پہنچایا جائے، تاکہ کمیونسٹ تحریک کا زور بھی ٹوٹے اور حکمرانوں اور جمہور کو بھی اتنا شعور آ سکے کہ

انقلاب کے تشکیل کردہ نظام کو بہتر شکل میں چلا سکیں۔
ان کتابوں پر قیمت درج نہیں۔

ماہنامہ "محدث" لاہور
اشاعتِ خاص "جمہوریت یا اسلام"
ادارت: جناب حافظ عبدالرحمن مدنی
چندہ سالانہ: -/۱۵ روپے
دفتر: ۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن لاہور

محدث ایک مفید دینی جریدہ ہے۔ مدیر دینی کاموں کا بڑا جذبہ رکھتے ہیں۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے اس اشاعتِ خاص میں کتاب، سنّت اور آثار سے یہ ثابت کیا ہے کہ جمہوری نظام غیر اسلامی ہے اور اسلام کی ہیئت سیاسیہ کے صرف دو اجزا ہیں۔ امیر اور مجلس شوریٰ۔ ان مرتبوں کے لیے بھی انتخابات کا سسٹم غلط ہے۔ کوئی اور صورت ہونی چاہیے۔ امیر جسے چاہے مجلس شوریٰ میں لے اور مشورہ چاہے تو اکثریت کا مانے، چاہے اقلیت کا۔ چاہے کسی کا نہ مانے۔ یہ خلاصہ میرے ناقص فہم میں آیا ہے۔

میں اپنے ایک صاحبِ علم دوست کا حریف بن کر بات کرنا پسند نہیں کرتا، مگر تبصرے کے طور پر فقط اتنی بات کہوں گا کہ ہمارے واجب الاحترام اصحابِ مسجد و مدرسہ کی اکثریت دین و شریعت کے کتابی علم کی جتنی ماہر ہے، کاش کہ وہ آنکھیں بند کر کے فتویٰ دینے کے مروجہ انداز کو چھوڑ کر بدلتے ہوئے احوال و ظروف، دَورِ نو کے ادارات اور جدید طبقوں اور عوام کی ذہنی کیفیات کو بھی سامنے رکھ کر یہ سوچنے کی کوشش کریں کہ آج کس مشینری کے ذریعے اسلام کے اُصول و مقاصد کو بہتر طور پر حاصل کیا جا سکتا ہے اور اپنی ۸ کروڑ آبادی کو اور بیرونی دُنیا کو بھی کس طرح اطمینان دلایا جا سکتا ہے کہ ہم جو تجربہ کرنے چلے ہیں، وہ ملتِ اسلامیہ کے لیے، معاشرے کے عوام کے لیے اور مجموعی طور پر انسانیت کے لیے باعثِ افادہ و خیر ہے، اور اس سے کوئی ایسے خطرات وابستہ نہیں ہیں جو لوگوں کے ذہنوں میں عام طور پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ پھر یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ اپنے تعلیم یافتہ طبقوں اور عوام دونوں کو درکنار رکھ کر جبریت کی مدد کے بغیر کوئی اسلامی یا غیر اسلامی نظام نہیں چلایا جا سکتا۔ اور جبریت مسئلے کا کوئی دائمی حل نہیں ہے۔

یہی وہ حقائق تھے، جن کو سامنے رکھ کر جنوری ۱۹۵۱ء میں ملک کے مغربی اور مشرقی حصے کے ۳۱ ممتاز اور نامور علما نے اپنے گروہی اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اسلامی دستور کے لیے ۲۲ متفقہ اصول طے کیے تھے۔ ایسے مکمل اجماع کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آج اس درجے کے اتنے اہلِ علم حضرات کو تلاش کرنا مشکل ہے۔ کیا ان سب کا اجماعی فیصلہ باطل تھا؟ کیا ان کے سامنے کتاب وسنّت کے وہ نصوص نظائر نہ تھے جو محدّث میں پیش کیے گئے ہیں؟ کیا ان کے فیصلے کو اتنی زبردست قبولیت عام حاصل نہیں ہوئی تھی کہ ملک کے تمام علما نے بے چون وچرا اُن کی تائید کی تھی بلکہ خوشی منائی گئی تھی، اور پھر ۱۹۵۶ء کے دستور کی اسلامی دفعات اُن کے نقطۂ نظر کے مطابق بنی تھیں۔

بہرحال اگر حافظ مدنی صاحب اس مسئلے پر ازسرِنو غور کریں تو بہتر۔ ورنہ وہ اپنی رائے پر، اور دوسرے اپنی آرا پر!

ہمارے نکاح

از- ڈاکٹر زاہد حسین ہومیوپیتھ

پتہ: بالائی منزل، عنایت واچ کمپنی ریلوے روڈ، سیالکوٹ شہر

یہ پمفلٹ اصلاحِ معاشرہ کے جذبے سے لکھا گیا ہے اور غالباً مفت تقسیم کے لیے ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نکاح سے متعلقہ اُمور میں پھیلی ہوئی خرابیوں کے خلاف پُرزور تلقینِ اصلاح کی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں خرابیِ احوال کے متعلق بہت سے جذبات کا ایسا شدید دباؤ ہے کہ انہیں اپنے خیالات کو منظم و مرتب کر کے "چوتھے بارِیک" کی شکل میں لاتے ہوئے خاصی مشکل پیش آئی ہے۔ کچھ مقامات پر جزوی اختلاف بھی ہوا، مگر بہ حیثیت مجموعی مقصد خیر و خوبی ہے۔ بہتر ہوتا کہ ڈاکٹر صاحب کتاب وسنّت کی تلقینات کی روشنی میں گفتگو فرماتے۔

ادارہ ترجمان القرآن کی نئی پیشکش

جناب محمد صلاح الدین صاحب مدیر "جسارت"

کے قلم سے

بنیادی حقوق

پیش لفظ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

حرف آغاز

محمد صلاح الدین

کاغذ ولایتی — طباعت آفسٹ — کور خوبصورت

سائز ۱۸×۲۲/۸

قیمت: بیس ۲۰ روپے

ادارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور

جولائی ۱۹۸۱ء
رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴

خطباتِ یورپ

— از —

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

- کتاب : جس کا آپ کو عرصے سے انتظار تھا
- کتاب : جو رسائل کے دامن میں بکھر کر کھو گئی تھی
- کتاب : جو معانی کا سمندر اور دعوتِ اسلامی کا قلزم اپنے دامن میں رکھتی ہے
- کتاب : جو اسلام کی دعوت لے کر یورپ کی بستی بستی میں جانے کا جذبہ اور داعیہ پیدا کرتی ہے
- کتاب : جو آپ کے بے شمار سوالات کے تسلی بخش جواب دیتی ہے
- کتاب : جو ملحدانہ ماحول اور مادہ پرستانہ فضا میں توحید کی آواز بلند کرتی اور روحانیت کی شمع روشن کرتی ہے
- کتاب : جو دورِ حاضر میں اسلامی انقلاب کی بانگِ درا ہے
- کتاب : جس کے بغیر مولانا مودودیؒ کا لٹریچر آپ کے پاس نامکمل ہے

ضخامت: ۲۵۶ صفحات ○ سائز: ۲۳ × ۱۸ / ۸

قیمت : ۲۴/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن۔ اچھرہ۔ لاہور